L. No. 7243

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مارچ 1978

اس پرچہ میں

۱- آزادی کا پیامبر عظیمؐ

۲- اسلامی قوانین کے راستے میں حائل کون ہے؟

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : 2 روپے

تبویب القرآن

● آپ کے ذہن میں کوئی سوال آئے اور آپ معلوم کرنا چاہیں کہ اس کی بابت قرآن مجید نے کیا کہا ہے اور کہاں کہاں کہا ہے تو اس کتاب سے آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا۔

● اس کتاب میں منفرد قریب دو ہزار چار سو عنوانات ہیں اور ہر عنوان کے تحت ان آیات کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں اس کے متعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآن مجید میں کچھ کہا گیا ہے۔ آپ اس کتاب کی وسعت کا اندازہ لگا لیجئے۔ یہ مفکر قرآن کی چالیس سال کی محنت شاقہ کا ماحصل ہے۔

● کتاب بڑے سائز کے ۲۱۵۱ صفحات پر چھپی ہوئی ہے۔ عمدہ سفید کاغذ، آفسٹ کی چھپائی، تین مضبوط اور دیدہ زیب جلدیں ہیں۔ قیمت مکمل سیٹ۔ ایک سو ساٹھ روپے۔ بمعہ محصول ڈاک چھ روپے
چونکہ کتاب مکمل سیٹ ہی میں کارآمد ہو سکتی ہے اس لئے اس کی الگ الگ جلدیں مہیا نہیں کی جاتیں۔

ملنے کا پتہ

مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور ● ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ — لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلی فون	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان ..... ۲۴/- روپے غیر ممالک ..... ۳ پونڈ	۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ لاہور	۲ دو روپے
جلد ۳۱	مارچ ۱۹۷۸ء	شمارہ ۳

فہرست

۱۔ لمعات ۲

(ہندو ذہنیت کیا ہے؟)

۲۔ آزادی کا پیامبرِ عظیمؐ ..... (محترم پرویز صاحب) ۹

(خطاب بتقریب عید میلاد النبیؐ)

۳۔ اسلامی قوانین کے راستے میں کون حائل ہے؟ ۳۷

(علماء کے باہمی اختلافات)

۴۔ حقائق و عبر ..... (۱) انتخابات ــــ مخلوط یا جداگانہ ۶۹

(۲) شیشم کے درخت کے ساتھ نکاح

(۳) اسلامی نظام اور فقہ جعفری

(۴) انہیں تاریکی راس آتی ہے۔

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد۔ مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ۱۷ ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ھندو!

ہندو نہ کسی فرد کا نام ہے۔ نہ کسی فرقہ کا اور نہ کسی قوم کا۔ یہ ایک ذہنیت ہے جو تنگ نظری، انتقام جوئی، مفاد پرستی سے ترتیب پاتی اور نفرت، عداوت، فریب دہی اور روباہ بازی کے جذبات پر پروان چڑھتی ہے۔ ہندوؤں کی ساری تاریخ میں صرف ایک سیاسی فلاسفر پیدا ہوا ہے۔ نام تو اس کا چانکیہ تھا لیکن وہ اپنے آپ کو نہایت فخر سے کوٹلیا کہتا تھا، اور ہندو بھی اُسے اسی لقب سے پکارتے ہیں۔ کوٹلیا کے معنی ہیں مکار اور فریب کار۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جو گرو اس ذہنیت کا مالک ہو اس کے چیلے کن خصوصیات کے حامل ہوں گے۔ اس نے اصولِ سیاست پر ارتھ شاستر کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ کتاب سنسکرت میں تھی لیکن چند سال اُدھر، اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا تھا۔ اس میں کوٹلیا صاحب نے جو اصولِ سیاست درج فرمائے ہیں، ان میں سے چند ایک ملاحظہ فرمایئے۔

پہلا اصول:۔ حصولِ اقتدار اور ملک گیری کی ہوس کبھی ٹھنڈی نہ ہونے پائے۔

دوسرا اصول:۔ ہمسایہ سلطنتوں سے وہی سلوک روا رکھا جائے جو دشمنوں سے رکھا جاتا ہے۔ تمام ہمسایوں پر کڑی نگرانی رکھی جائے۔

تیسرا اصول:۔ غیر ہمسایہ سلطنتوں سے دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں۔

چوتھا اصول:۔ جن سے دوستی رکھی جائے، اس میں بھی ہمیشہ اپنی اغراض پیشِ نظر رہیں اور مکارانہ سیاست کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔

پانچواں اصول:۔ دل میں رقابت کی آگ مشتعل رکھی جائے۔ ہر بہانہ سے جنگ کی چنگاریاں سلگائی جاتی رہیں۔ جنگ میں انتہائی تشدد سے کام لیا جائے۔ حتیٰ کہ خود اپنے شہریوں کے مصائب و آلام کی بھی پرواہ نہ کی جائے۔

چھٹا اصول:۔ دوسرے ملکوں میں مخالفانہ پروپیگنڈہ۔ تخریبی کاروائیاں اور ذہنی انتشار پیدا کرنے کی مہم جاری رکھی جائے۔ وہاں اپنے آدمی ناجائز طریق سے داخل کرکے، ففتھ کالم بنایا جائے اور یہ سب کچھ بالالتزام کیا جائے۔

ساتواں اصول:۔ رشوت اور دیگر اسی قسم کے ذرائع سے اقتصادی جنگ جاری رکھی جائے اور دوسرے ملکوں کے آدمیوں کو خریدنے کی کوشش کی جائے۔

آٹھواں اصول:۔ امن کے قیام کا خیال تک بھی دل میں نہ لایا جائے خواہ ساری دنیا اس پر مجبور کرے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں سیاست کے وہ اصول جو اس قوم کے ایک "مہاتما" نے انہیں دیئے تھے جب مہاتما ہی کے ست جگ کے زمانے کی پیداوار تھے۔ یعنی وہ زمانہ جس میں، ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق، سچائی کا دور دورہ تھا۔ اس کے بعد کلجگ میں ایک اور مہاتما پیدا ہوئے جنہیں گاندھی جی کہا جاتا، اور سچائی کا مجسمہ اور اہنسا (عدمِ تشدد) کا اوتار کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ان مہاتما جی کی ذہنیت کس قسم کی تھی اس کے متعلق قائدِ اعظمؒ کی زبان سے سنیئے جنہیں ان کے ساتھ دن رات واسطہ پڑتا تھا۔ انہوں نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن (جالندھر) کے اجلاس منعقدہ سنہ ۱۹۴۲ء میں، پبلک پلیٹ فارم سے کہا تھا:۔

مشکل یہ ہے کہ گاندھی جی کا حقیقی مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں اور جو کچھ ان کے دل میں ہوتا ہے، اسے کبھی زبان پر نہیں لاتے۔

اسی طرح انہوں نے اگست ۱۹۴۵ء میں ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

> ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ جب ان کے (یعنی مہاتما گاندھی کے) مفید مطلب ہوتا ہے وہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے نمائندہ نہیں۔ وہ محض انفرادی حیثیت سے گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ کانگریس کے چار آنہ کے ممبر بھی نہیں۔ اور جب ضرورت ہوتی ہے تو سارے ہندوستان کے واحد نمائندہ بن جاتے ہیں۔ جب اور حربوں سے کام نہیں چلتا تو مرن برت رکھ لیتے ہیں۔ جب کوئی دلیل بن نہیں پڑتی تو "اندرونی آواز" کو بلا لیتے ہیں۔ کہئیے کہ ایسے شخص سے کوئی کس طرح بات کر سکے! وہ تو ایک چیستاں ہیں معمہ ہیں!!

یہ ذہنیت کسی کی انفرادی افتادِ طبیعت کا نتیجہ نہیں' یہ ہندو دھرم کی پیدا کردہ ہے۔ مسٹر سری پرکاش' پاکستان میں بھارت کے پہلے ہائی کمشنر تھے۔ انہوں نے ۱۳ر نومبر ۱۹۴۸ء کو' تھیا سوفیکل ہال کراچی میں ایک تقریر کی تھی جس کا عنوان تھا۔ "ہندومت' ایک ضابطۂ اخلاق کی حیثیت سے"۔ اس تقریر میں انہوں نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ جو شخص سمجھتا ہے کہ ہندومت کوئی مستقل ضابطۂ اخلاق پیش کرتا ہے جس پر سوسائٹی کی بنیاد رکھی جا سکے' وہ بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔

> کسی کو یہ بات پسند آئے یا نہ آئے' یہ حقیقت ہے جس کا کھلے بندوں اعتراف کرنا چاہیئے کہ ہندومت میں کوئی قطعی' غیر متبدل اصولِ زندگی نہیں۔ ہر مصلحت کے لئے اس کا الگ اصول ہے۔ ہندومت' ایک عملی مذہب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر موقعہ پر دیانت اور سچائی سے کام نہیں چل سکتا اس لئے وہ کبھی ایسی تعلیم نہیں دیتا جو ناممکن العمل ہو۔ یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر ہندومت ہزار سال سے مختلف حالات اور متبائن ماحول میں زندہ رہا اور زندہ رہے گا۔

(طلوعِ اسلام - دسمبر ۱۹۴۸ء)

ہزارہا سال تک زندہ رہنے کے بعد' جب اس قوم کو ہندوستان سے انگریز کے چلے جانے کے آثار دکھائی دینے لگے تو اس نے محض "زندہ رہنے" کی خواہش تک انحصار نہ کیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد' اپنی صدیوں کی غلامی کا انتقام مسلمانوں سے لیا جائے۔ اس قوم کے "مردِ آہن" سردار پٹیل کی اسکیم تھی کہ مسلمانوں کو پھر سے ہندو بنا لیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے مارچ ۱۹۴۷ء میں' احمد آباد میں ایک تقریر کے دوران کہا کہ:۔

> جو لوگ جداگانہ قومیت کے متمنی ہیں ان میں سے نوے فی صد وہ ہیں جو اس ملک کی مٹی کی پیداوار ہیں۔ اس لئے اگر یہ لوگ پھر اپنی اصل میں جذب نہیں کئے جا سکتے تو یہ ان لوگوں کا قصور ہے جن سے نکل کر یہ لوگ الگ ہوئے تھے۔

(طلوعِ اسلام - اپریل ۱۹۴۷ء)

جو لوگ سردار پٹیل کی اس اسکیم کو ممکن العمل نہیں سمجھتے تھے ان کے عزائم یہ تھے کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ملک میں جمہوری نظامِ حکومت رائج کیا جائے اور اس طرح اپنی ناقابلِ تغیر عددی اکثریت (IN-CONVERTIBLE MAJORITY) کی بنا پر مسلمان اقلیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا محکوم رکھا جائے۔

یہ تھے اس قوم کے عزائم جنہیں' ملتِ اسلامیہ کے مردِ مجاہد' قائداعظمؒ نے دس سال کی مسلسل جنگ کے بعد' خاک میں ملا دیا اور ہندو کو ملک کی تقسیم کو تسلیم کرنا پڑا۔ کوئی دیانتدار قوم ہوتی تو تقسیم ہند کے اس فیصلے کو (خواہ وہ اس کی مرضی کے خلاف ہی ہوا تھا) کشادہ دلی سے قبول کر لیتی' لیکن ہندو ذہنیت سے اس قسم کی توقع رکھنا عبث تھا۔ پاکستان' کانگریس اور مسلم لیگ کے باہمی سمجھوتے سے وجود میں آیا تھا۔ اس سمجھوتے کا اعلان ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو ہوا تھا' اور ۱۶ر جون کو اسی کانگریس کی آل انڈیا کمیٹی نے حسبِ ذیل ریزولیوشن پاس کیا تھا:۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آجائے گی تو ہندوستان کے مسئلہ کا حل صحیح صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود قرار پا جائے گا۔

کانگریس کی طرف سے تقسیمِ ہند کے فیصلے پر دستخط پنڈت جواہر لال نہرو نے کئے تھے۔ وہ ایک طرف اس دستاویز پر دستخط کر رہے تھے اور دوسری طرف اپنی قوم سے کہہ رہے تھے کہ:-

ہماری سکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔

کانگریس سے باہر دیوان چمن لال جیسا (بظاہر) اعتدال پسند لیڈر یہ کہہ کر ہندوؤں کی ڈھارس بندھا رہا تھا کہ:-

میں ناامید ہونے والوں میں نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تقسیمِ ہند ایک عارضی سا حادثہ ہے۔ اس کے باوجود ہم تیس کروڑ ہندوؤں کو اپنا مقصد کے حصول کے لئے جان تک دیدینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ یہ بہت غلط ہوگا کہ ہم اپنی قوم کو امن اور شانتی کی لوریاں دے دیکر اسی طرح سلائے رکھیں جس طرح ہم نے انہیں اس وقت تک سلائے رکھا ہے اور جس کا نتیجہ اب ہمارے سامنے ہے۔ ہم میں بنیادی نقص یہ ہے کہ ہم ضرورت سے زیادہ امن پسند واقعہ ہوئے ہیں۔ (آرگنائزر۔ ۳ر جولائی ۱۹۴۷ء)

دوسری طرف ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی، اپنی قوم کو یہ وِیاکھیان (وعظ) سنا رہے تھے کہ:-

ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان کا حصہ بنا لیا جائے۔ اس حقیقت کے متعلق میرے دل میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا خواہ یہ معاشی دباؤ سے ہو یا سیاسی دباؤ سے یا اس کیلئے دیگر ذرائع استعمال کرنے پڑیں۔ (ایضاً)

ہندو مہا سبھا کے صدر، مسٹر ساورکر نے اس سے بہت پہلے ایک اسکیم مرتب کی تھی جس کا انکشاف قائداعظمؒ نے دسمبر ۱۹۴۱ء میں ان الفاظ میں کیا تھا:-

ساورکر کی اسکیم یہ ہے کہ جب (انگریز کے جانے کے بعد) میدانی، بحری اور فضائی فوج میں ہندوؤں کو ۷۵ فیصد حصہ مل جائیگا تو پھر ہندو راج قائم کرنے کی کوشش کی جائیگی۔ ان مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا جو شمال مغرب اور شمال مشرق میں بستے ہیں؟ ان کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ سرحدوں پر ہندو فوج اس طرح بٹھا دی جائیگی جس طرح اب برطانوی فوج متعین ہے۔ یہ فوج اس کا خیال رکھے گی کہ مسلمان سر نہ اٹھا سکیں۔

(آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس میں تقریر)

ط اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسلم ذہنیت کی ایک مثال بھی سامنے لائی جائے۔ تقسیمِ ہند کا اصولی فیصلہ ہو جانے کے بعد ایک باؤنڈری کمیشن مقرر ہوا کہ وہ پاکستان اور ہندوستان کی حدبندی کا تعین کرے۔ لارڈ ریڈکلف اس کمیشن کے سربراہ تھے۔ اس شخص نے انتہائی بددیانتی اور دیدہ دلیری سے پاکستان کے نہایت اہم حصے ہندوستان کی طرف منتقل کر دیئے۔ اس پر مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا ہوا اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ اس فیصلہ کو مسترد کر دیا جائے لیکن قائداعظمؒ نے اس احتجاج کے جواب میں جو کچھ فرمایا وہ مسلم ذہنیت کا صحیح صحیح آئینہ دار ہے۔ انہوں نے فرمایا:-

بلاشبہ تشکیلِ پاکستان میں ہمارے ساتھ سخت ناانصافیاں روا رکھی گئی ہیں اور اس عظیم مملکت کی سرحدوں کو ہر ممکن حربے سے سکیڑ دیا گیا ہے۔ ریڈکلف کا ایوارڈ ہمارے جسم پر آخری چرکہ ہے۔ یہ بعید از عقل و انصاف ثالثی فیصلہ، کج فہمی اور کج روی کا منحوس پیکر ہے۔ لیکن یہ کتنا ہی غلط اور بے جواز کیوں نہ ہو، ہم اسے قبول کرنے کا عہد کر چکے ہیں اور ہم اس عہد کے پابند ہیں۔ ہم ایک باعزت قوم کی طرح امید لگائے چلے جائیں گے اور عزم و استقامت اور بہت جرأت سے مصائب برداشت کرنے کی توفیق رکھتے ہیں۔ خدا نے چاہا تو ان مصائب کے باوجود ہم اس آگ سے کندن بن کر نکلیں گے۔

"ہم اسے قبول کرنے کا عہد کر چکے ہیں اور ہم اس عہد کے پابند ہیں"۔۔۔۔۔ یہ ہے مسلم ذہنیت۔

سوشلسٹوں کے متعلق عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ان میں مذہبی تعصب نہیں ہوتا کیونکہ وہ سیکولر ذہنیت رکھتے ہیں۔ لیکن جہاں تک مسلمانوں کے خلاف جذباتِ عداوت کا تعلق ہے' ہندوؤں کے سوشلسٹ طبقہ اور مہاسبھا میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ہندوستان کی سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے اپنی کتاب "اگلا قدم" میں لکھا تھا۔

> ہم زیادہ عرصہ تک انتظار نہیں کر سکتے۔ شاید دو تین سال کے عرصہ میں امرتسر اور پاکستان کی درمیانی حدِ فاصل مٹ جائے گی۔ ہمیں پاکستان کے اس زہر کو ختم کر کے تقسیمِ ہند کو کالعدم کر دینا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مصنوعی تقسیم ختم ہو جائے گی اور پاکستان اور ہندوستان پھر سے ایک ملک ہو جائیں گے۔

اس دو تین سال کے عرصہ میں پاکستان کو ختم کرنے کے لئے "کیا کیا عملی تدابیر اختیار کی گئیں' انکی تو تفصیل طول طویل ہے۔ ان کی ایک آدھ مثال ملاحظہ فرمائیے۔ تقسیم کے معاہدہ کی رو سے، ایک لاکھ پینسٹھ ہزار ٹن فوجی سامان پاکستان کے حصے میں آیا تھا۔ اس میں سے ہندوستان نے، ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۴۸ء تک، صرف (۳۰۲۷۴) ٹن سامان پاکستان کو دیا۔ باقی دبا بیٹھا۔ جہاں تک نقد روپے کا تعلق ہے' پاکستان کے حصہ میں ایک ارب روپیہ آتا تھا۔ ہندوستان نے اس رقم کی ادائیگی سے بھی انکار کر دیا۔ اور دسمبر سنہ ۱۹۴۷ء میں بعد مشکل اس پر رضامند ہوا کہ پاکستان کو (۷۵) کروڑ روپیہ دیا جائے۔ اس میں سے بیس کروڑ روپیہ پاکستان مل چکا تھا۔ ہندوستان بقایا (۵۵) کروڑ روپیہ دبا کر بیٹھ گیا۔ جب بین الاقوامی دباؤ کے تحت ہندوستان کو یہ روپیہ ادا کرنا پڑا تو اس میں سے پانچ کروڑ کی ڈنڈی مار گیا۔ (اس کے برعکس ہندوستان کے حصے کے نوے ہوائی جہاز پاکستان میں پڑے تھے۔ پاکستان نے نوے کے نوے بحفاظت ہندوستان کے حوالے کر دیئے)۔ یہ کچھ تو ہندو کی طرف سے حکومتی سطح پر ہو رہا تھا۔ انفرادی طور پر ہندو کیا کر رہا تھا، اس کا اندازہ ایک مثال سے لگائیے کہ حکومتِ ہند کے ایک اعلیٰ ہندو افسر نے پاکستان کے انجینئرنگ سٹور ڈپو میں متعین بعض انگریز افسروں سے سازباز کی جس کی رو سے پاکستان کی کروڑوں روپے مالیت کی مشینری خفیہ طور پر ہندوستان پہنچائی جا رہی تھی۔ (پاکستان ٹائمز، ۲۸ جنوری سنہ ۱۹۴۸ء بحوالہ پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۲۸ جنوری سنہ ۱۹۶۷ء) وہ تو غنیمت ہوا کہ یہ سازش بروقت پکڑی گئی، اور یہ مشینری ہندوستان پہنچنے سے بچا لی گئی لیکن کیا معلوم کہ اس قسم اور کس قدر (کامیاب) سازشیں ہوئی تھیں۔ پاکستان کو فوجی اور مالی اعتبار سے اس طرح مفلوج بنا دینے کے بعد ہندو کے ارادے کیا تھے اس کا انکشاف وہاں کے سابق چیف جسٹس مسٹر مہاجن نے ان الفاظ میں کیا تھا کہ ہندوستان نے دسمبر سنہ ۱۹۴۷ء میں فیصلہ کر لیا تھا کہ پاکستان پر حملہ کر دیا جائے لیکن بعض داخلی مصالح کے پیشِ نظر اس فیصلہ پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ اس کے تین سال بعد' راجہ مہندر پرتاپ نے اپنی قوم کو مشورہ دیا تھا کہ :۔

> جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہو جاتا ہمارا ملک کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا چلا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ لاینفک ہو گئی ہے۔ بنا بریں میں حکومتِ ہند کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر پاکستان کو ختم کر دے۔ (ویر بھارت - ۲۱ دسمبر سنہ ۱۹۵۰ء)

چنانچہ جب سنہ ۱۹۵۰ء میں بنگال میں فسادات کرائے گئے تو اس کے ساتھ ہی وہاں پاکستان پر فوجی حملہ کرنے کی تحریک بھی چلائی گئی جس کی تائید پنڈت نہرو اور جے پرکاش نارائن جیسے چوٹی کے ہندو لیڈروں نے کی۔ ابتدائے سنہ ۱۹۶۵ء میں ہندوستان نے رن آف کچھ میں چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تو وہاں کے ہوم منسٹر، مسٹر نندا نے لوک سبھا میں اعلان کیا کہ ہم نے پوری آٹھ لاکھ فوج کو تیاری کا حکم دے دیا ہے۔ اور وزیراعظم نے یہ کہہ کر اس کی تائید کی کہ آج ہندوستان کی پینتالیس کروڑ آبادی ہر قربانی کے لئے تیار بیٹھی ہے۔ ادھر رن آف کچھ میں یہ کچھ ہو رہا تھا اور ادھر انہوں نے مشرقی پاکستان میں پاکستانی علاقہ واہ گرام پر دھاندلی سے قبضہ کر لیا۔ ستمبر سنہ ۱۹۶۵ء میں وہ

جس طرح شب خون مار کر مغربی پاکستان کی سرحدوں پر چڑھ دوڑے تھے، اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ جب پاکستان کے جیالے غیور مجاہدوں نے ان کے ان مذموم عزائم کو خاک میں ملا دیا تو بھارت کے وزیر دفاع مسٹر چوہان نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ:-

پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اسی دن سے مخاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس دن پاکستان معرض وجود میں آیا تھا۔ پاکستان اور بھارت میں آئیڈیالوجی کا اختلاف ہے۔ اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ اختلاف اور دشمنی مہینے یا ہفتے بھر کی نہیں بلکہ سالہا سال تک رہے گی۔ بھارت کو اس کے لئے ایک تازہ اور فیصلہ کن جنگ کے لئے تیار رہنا چاہئیے۔

(طلوع اسلام - فروری ۱۹۶۶ء)

اور اس "فیصلہ کن جنگ" کے لئے ہندو نے مشرقی پاکستان کا میدان تاکا۔ بھارتی پارلیمان کے ایک ممتاز ممبر مسٹر سبرا منیم سوامی پاکستان کے خلاف جنگ کے سلسلہ میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ انہوں نے دہلی سے شائع ہونے والے مجلہ آرگنائزر کے ۳ر جولائی ۱۹۷۳ء کے شمارہ میں ۱۹۷۱ء کی (مشرقی پاکستان کی) جنگ کے سلسلہ میں، ایک اہم مقالہ شائع کیا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا کہ:-

۱۹۷۱ء سے بھارتی حکومت کے زیادہ تر اور اہم فیصلے قوم پرست افلاکرایا کرتے ہیں۔ پہلا فیصلہ پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے اور بنگلہ دیش قائم کرنے کا تھا۔ جن سنگھ نے اگست ۱۹۷۱ء میں زبردست عوامی مظاہروں سے ملک کو ہلا کر رکھ دیا۔ اور چونکہ ۱۹۷۲ء میں انتخابات ہونے والے تھے اس لئے اندرا گاندھی "کرسی سرکھشا" کے لئے اپنی پالیسی ترک کرنے اور جنگ چھیڑنے پر مجبور ہو گئیں ...... بھارت نے یہ جنگ محض قوم پرستوں کی تسلی اور نتیجتاً اس مقبول عام نظریہ کی تشفی کے لئے چھیڑی تھی کہ "پاکستان کا ٹکڑے ہو جانا" بھارت کے طویل المیعاد دوررس مفاد میں ہے ...... بھارتی قوم پرست بچے کھچے پاکستان کے بھی درپے ہیں اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی فکر میں ہیں کہ یہی اکھنڈ بھارت کا راستہ ہے۔

اس کے بعد مسٹر سبرامنیم نے لکھا تھا:-

کسی بھارتی نے تقسیم ہند کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا۔ اور نہ کبھی کرے گا ...... پاکستان میں پہلے ہی دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب پختونستان، سندھو دیش اور بلوچستان کی تشکیل و قیام کے لئے دباؤ بڑھ جائیگا ہم بھارتیوں کو نفسیاتی طور پر اس کیلئے تیار رہنا چاہئیے اور اس وقت اپنی فوجیں پاکستان میں داخل کر دینی چاہئیں کہ پختونستان۔ سندھو دیش اور بلوچستان کے سربراہ ہمارے متلاشی ہوں گے۔

(بحوالہ طلوع اسلام - بابت نومبر ۱۹۷۳ء)

مسٹر سبرامنیم نے کہا ہے کہ "بھارتیوں کو پاکستان کو ختم کر دینے کے لئے نفسیاتی طور پر تیار رہنا چاہئیے۔" انہیں اس مقصد کے لئے نفسیاتی طور پر کس طرح تیار کیا جا رہا ہے، یہ داستان بڑی دلچسپ بھی ہے اور عبرت آموز بھی۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، یہ اہل پاکستان کے سامنے اس سے پہلے نہیں آئی۔ اسے بڑی گہری توجہ سے سنئے۔

(جیسا کہ معلوم ہے) مہاتما گاندھی، ہندوؤں کے سیاسی لیڈر ہی نہیں تھے۔ وہ ان کی، اوتار کی حیثیت سے پرستش کرتے تھے۔ انہی مہاتما گاندھی کو جنوری ۱۹۴۸ء میں ایک ہندو نوجوان، نتھورام گوڈسے نے اس وقت پستول کا نشانہ

۱؎ ہندوستان کے وزیر خارجہ مسٹر باجپائی جو حال ہی میں پاکستان کے دورہ پر آئے تھے، اسی جن سنگھ کے صدر تھے۔ اور جماعت اسلامی (ہند) کے امیر نے جو مسٹر باجپائی کے دورہ کے موقعہ پر پاکستان آئے تھے، جیل سے رہا ہونے کے بعد، اسی جن سنگھ کے ساتھ ہم آہنگی کا اعلان کیا تھا۔

بنا کر قتل کر دیا تھا جب وہ اپنی شام کی پرارتھنا کے لئے آ رہے تھے۔ گوڈسے ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھا جو ہندوؤں کی کٹر متعصب جماعت ہندو مہاسبھا (یا اس کے عسکری ذیلی اداروں۔ جن سنگھ یا راشٹریہ سیوک سنگھ) سے وابستہ تھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ اس نے مہاتما گاندھی جیسے اہمسا (عدم تشدد) کے اوتار کو کس جرم کی پاداش میں قتل کیا ہے، تو اس نے کہا کہ مہاتما گاندھی کی اہمسا کی تعلیم نے قوم کو بزدل بنا دیا ہے جس کی وجہ سے وہ مسلمانوں اور پاکستان سے پورا پورا انتقام لینے کے قابل نہیں رہی۔ میں نے انہیں اسی جرم کی پاداش میں قتل کیا ہے۔

بمبئی سے شائع ہونے والے ہفتہ وار اخبار "السٹریٹڈ ویکلی" کی (۲۶-۲۰) نومبر ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں گوڈسے کے چھوٹے بھائی، گوپال گوڈسے کے قلم سے ایک مضمون چھپا ہے جس میں اس نے اس دن (۱۵ نومبر ۱۹۴۹ء) کی روئداد درج کی ہے جب نتھورام اور اس کے ساتھی مجرم، نارائن آپٹے کو انبالہ جیل میں پھانسی دی گئی تھی۔ (گوپال گوڈسے بھی اسی جرم میں ملوث، عمر قید کی سزا بھگت رہا تھا) گوڈسے نے وصیت کی تھی کہ اس کی راکھ دریائے سندھ میں بہائی جائے۔ اس کے بھائی نے اس سے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں، تو اس نے جواب دیا:

> اس لئے کہ سندھ ہی ہندوستان کا مقدس دریا ہے لیکن بدقسمتی سے وہ آج ہندوستان کے اندر نہیں۔ مہاتما گاندھی کی راکھ دنیا کے متعدد دریاؤں میں بہائی گئی لیکن حکومت پاکستان نے، بھارتی حکومت کو اس کی اجازت نہ دی کہ وہ گاندھی جی کی راکھ کو دریائے سندھ میں بہائیں۔ پاکستان نے، بھارت کی ہتک کی ہے جس کا مجھے صدمہ ہے۔ بھارتی حکومت کو چاہیئے تھا کہ گاندھی جی کی راکھ کا کچھ حصہ محفوظ رکھتی اور جب وہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان کا حصہ بنا لیتی تو اس راکھ کو دریائے سندھ میں بہاتی۔ پاکستان کے انکار سے بھارتی ہتک واضح ہے۔ اس نے خیال کیا کہ اگر ایک ہندو کی راکھ دریائے سندھ میں بہا دی گئی تو وہ دریا ناپاک ہو جائے گا۔ ہندو گھرانے میں جنم لینا کوئی جرم نہیں۔ ہندو کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا کوئی جرم نہیں۔ جو لوگ ہندوؤں سے نفرت کرتے ہیں وہ درحقیقت نوع انسان کے دشمن ہیں۔
>
> میں دریائے سندھ کو مقدس دریا سمجھتا ہوں۔ لفظ ہندو خود لفظ سندھو سے مشتق ہے۔ ہمارے ویدوں نے دریائے سندھ کی وادی میں جنم لیا تھا۔ تم ہندوؤں کا فریضہ ہے کہ پاکستان نے جو تمہاری ہتک کی ہے اسے یاد رکھو اور مناسب موقع پر اس علاقہ کو پھر سے فتح کرو۔ میری یہ خواہش شاید آنے والی ہندو نسلوں کے دل میں ملک کے ان دو حصوں کو پھر سے ایک کر دینے کے جذبہ کو بیدار رکھے۔

مضمون کے آخر میں، گوپال گوڈسے نے لکھا:۔

> نتھورام کی وصیت ایک خط کی شکل میں ہے۔ اس نے، اس میں اپنی اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ جب دریائے سندھ دوبارہ ہندوستان کے علاقہ میں بہنے لگے تو اس کی راکھ کو اس میں بہا دیا جائے۔ نتھورام اور اس کے ساتھی نارائن آپٹے کی راکھ پونہ میں، ہمارے گھر میں چاندی کے ایک برتن میں محفوظ رکھی ہے۔ ہر سال ۱۵ نومبر کو، ہزاروں افراد اس کے درشن کے لئے آتے ہیں۔ اور اس عہد کی تجدید کرتے ہیں کہ وہ مقدس دریائے سندھ کو پھر سے ہندوستان کا دریا بنانے کے لئے پوری پوری کوشش کریں گے۔

اس اقتباس کا آخری حصہ خصوصیت سے غور طلب ہے۔ نتھورام گوڈسے کی خواہش کو ایک فرد کی جذباتی خواہش قرار

ہم نے یہ بات آج ہی سنی ہے۔ معلوم نہیں اس میں کہاں تک صداقت ہے۔

دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہر سال، ہندو قوم کے سینکڑوں افراد کا اس راکھ کے درشنوں کے لئے جانا اور گوڈسے کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے عہد کی تجدید کرنا، اس قوم کی نفسیات کی غمازی کرتا ہے۔ قوموں میں اس قسم کے شعار بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہودیوں سے ملک فلسطین چھن گیا۔ ان کی مملکت گئی، حکومت گئی۔ ان کا مقدس شہر یروشلم ان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ وہ بے گھر، بے در، صحرا نورد قوم بن گئی۔ لیکن اس تمام عرصہ میں اس نے اپنے ایک شعار کو قومی یادگار کے طور پر قائم رکھا۔ وہ یروشلم جاتے اور سابقہ ہیکل کی ایک دیوار کے سامنے جا کر گریہ وزاری کرتے اور پکار پکار کر فریاد کرتے کہ ہمیں ہمارا کھویا ہوا وطن کب واپس ملے گا۔ (اس دیوار کا نام ہی "دیوارِ گریہ" پڑ گیا تھا)۔ وہ صدیوں تک ایسا کرتے رہے اور کسی نے ان کی اس "مذہبی رسم" کو چنداں اہمیت نہ دی۔ لیکن انہوں نے اس رسم کے ذریعے اپنی ہر نسل کے دل میں اپنے گم گشتہ وطن کی بازیابی کی خواہش کو زندہ اور بیدار رکھا۔ یہ اسی جذبہ کا اثر تھا کہ وہ اس خطۂ زمین پر دوبارہ قابض ہو گئے۔

مسٹر سبرامنیم نے کہا تھا کہ ہم بھارتیوں کو، پاکستان کو فتح کرنے کے لئے، نفسیاتی طور پر تیار رہنا چاہیئے۔ گوڈسے کی "راکھ درشن" کا شعار اسی نفسیاتی تیاری کی ایک مثال ہے۔ یہ واقعہ تو اخبار میں چھپ کر ہمارے سامنے آ گیا ہے۔ کیا معلوم وہاں اس قسم کی کتنی نفسیاتی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مسٹر سبرامنیم نے اس حقیقت پر سے پردہ اٹھا دیا تھا جب کہا تھا کہ:-

کسی بھارتی نے تقسیمِ ہند کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا۔ اور نہ کبھی کرے گا۔

اسی بنا پر قرآنِ مجید نے چودہ سو سال پہلے تاکید کی تھی کہ: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا۔ اے جماعتِ مومنین! دیکھنا، اپنوں کے سوا کسی کو اپنا ہمراز و دمساز نہ بنانا۔ وہ تمہاری تخریب اور تباہی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ۔ جس بات سے تمہیں نقصان پہنچے وہ اس سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ۔ تمہارے خلاف جو کچھ وہ سوچتے رہتے ہیں اس میں سے جو بھی کوئی بات ان کے منہ سے نکل جاتی ہے تو تمہیں کچھ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے عزائم کیا ہیں۔ لیکن جو کچھ ان کے سینے میں مخفی ہوتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ (۳/۱۱۸)

اب سوال یہ ہے کہ اس قسم کے دشمن سے محفوظ رہنے کے لئے کیا کیا جائے۔ اس کے لئے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ۔ (۸/۶۰) "اپنی سرحدوں کو فوجی چھاؤنیوں کے ذریعے مستحکم رکھو"۔ لیکن یہ اس تدبیر کا صرف خارجی پہلو ہے۔ اس کا داخلی پہلو یہ ہے کہ:-

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا یَضُرُّكُمْ كَیْدُهُمْ شَیْـًٔا۔ (۳/۱۲۰)

اگر تم ثابت قدم رہے اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے رہے تو ان کی خفیہ تدبیریں اور سازشیں تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گی۔

پاکستان، ان دشمنوں کے ہاتھوں سے صرف اسی صورت میں محفوظ رہ سکتا ہے۔ اپنی سرحدوں کی حفاظت اور قوانینِ خداوندی کی اطاعت۔

باسمہٖ تعالیٰ

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے

آزادی کا پیامبرِ عظیم [صلے اللہ علیہ وسلم]

عید میلاد النبیؐ کی تقریبِ سعید منعقدہ فروری ۱۹۷۸ء
پر، پرویز صاحب کا خطاب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آزادی کا پیامبرِ عظیم

عزیزانِ من! سلام و رحمت۔

سجدۂ تشکرانہ بدرگاہِ ربّ العزت کہ اس نے ہمیں پھر یہ توفیق عطا فرمائی کہ ہم اس ذاتِ اقدس و اعظم، رحمۃ اللعالمینؐ کی تقریبِ میلاد منانے کے لئے جمع ہوئے جس سے بلند مرتبت ہستی آسمان کی آنکھ نے نہیں دیکھی۔ آغازِ سخن کے لئے میری زبان پر بے ساختہ وہ اشعار آجاتے ہیں جو اس ذاتِ اطہرؐ کے آستانۂ عالیہ پر (عالمِ تصور میں) دستک دیتے ہوئے اقبالؒ نے پیش کئے تھے کہ ؎

آیۂ کائنات کا معنیٔ دیریاب تو　　　نکلے تیری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

میرا نشیمن نہیں، درگہِ میر و وزیر　　　میرا نشیمن بھی تو، شاخِ نشیمن بھی تو

تجھ سے میری زندگی، سوز و تب و درد و داغ　　　تو ہی مری آرزو، تو ہی مری جستجو!

اور اس کے بعد یہ عرضداشت کہ ؎

پھر وہ شراب کہن مجھ کو عطا کر کہ میں　　　ڈھونڈ رہا ہوں اسے توڑ کے جام و سبو

چشمِ کرم ساقیا! دیر سے ہیں منتظر　　　جلوتیوں کے سبو، خلوتیوں کے کدو

اس تقریب سے مقصد، اس ذاتِ گرامیؐ کی سیرتِ طیبہ کا تذکارِ جلیلہ ہوتا ہے۔ ایک ترشے ہوئے ہیرے کی طرح اس سیرتِ مقدسہ کے مختلف پہلو ہیں لیکن ہر پہلو بجائے خویش ایک تابندہ گوہر ہے۔ آج کی تقریب میں، ان میں سے صرف ایک گوشہ کی جھلک سے آئینہ پوشیٔ محفل کی کوشش کرونگا۔ اور وہ گوشہ یہ ہے کہ ظہورِ نبویؐ سے عالمِ انسانیت کو کس قسم کی آزادی نصیب ہوئی۔

آزادی!

یہ وہ متاعِ گراں بہا ہے جس کے لئے انسان نے کسی قربانی کو بھی زیادہ قیمتی نہیں سمجھا۔ اس کی خاطر قوموں نے اپنا خون، پانی کی طرح بہایا ہے۔ بڑی بڑی لڑائیاں لڑی ہیں۔ افراد نے اپنا گھربار لٹا دیا۔ قید و بند کی صعوبتیں

برداشت کیں۔ دار و رسن کو خندہ پیشانی سے چوما۔ جلاد کی تلوار کو آگے بڑھ کر سینے سے لگایا۔ انسان نے یہ سب کچھ جھیلا ہے، آزادی کی خاطر۔ اس نے اس کے مجسمے تراشے اور دیوی کی طرح اس کی پرستش کی ہے۔ دنیا کی کوئی قوم نہیں جس نے آزادی کی شان میں حمد و ستائش کے نغمے نہ گائے ہوں۔ اس کے چرنوں (قدموں) میں اپنی شردھا (عقیدت) کے پھول نہ چڑھائے ہوں۔ غور کیجئے تو انسان کی تمدنی زندگی کی ساری تاریخ حصول و استحکام آزادی کی خونچکاں داستان ہے۔

انسان نے یہ سب کچھ آزادی کی خاطر کیا ہے لیکن یہ حقیقت کس قدر حیرت انگیز اور (بظاہر) ناقابلِ فہم ہے کہ جس آزادی کی خاطر اس نے یہ سب کچھ برداشت کیا ہے، وہ آج تک متعین نہیں کر سکا کہ وہ ہوتی کیا ہے؛ وہ سمجھ نہیں سکا کہ آزادی کا مفہوم کیا ہے۔ وہ بتا نہیں سکتا کہ آزادی کہتے کسے ہیں۔ ہمارے ہاں تو چونکہ صدیوں کی تقلید اور جمود نے سمجھنے سوچنے کے چراغ گل کر رکھے اور فکر و تدبر کی راہیں مسدود کر دی ہیں اس لئے ہم نے زندگی کے اس سب سے اہم سوال پر کبھی غور ہی نہیں کیا۔ لیکن آپ مغرب میں دیکھئے کہ آزادی کے معانی اور مفہوم کے موضوع پر کس قدر تحقیق ہوتی چلی آئی ہے۔ اور کیسی کیسی بلیغ اور ضخیم کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ہم اور ہماری جیسی دیگر سطحی نگاہ کی حامل قومیں اتنا ہی جانتی ہیں کہ اگر کوئی قوم کسی دوسری قوم کی محکوم ہو تو اسے غلامی کہتے ہیں اور اگر وہ خود حکمران ہو تو اسے آزادی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں حصولِ آزادی سے مراد ہی کسی دوسری قوم کی محکومیت کی جگہ اپنی حکومت قائم کرنا ہوتا ہے۔ لیکن آپ غور کیجئے اور اپنے دل سے پوچھئے کہ کیا خود اپنی حکومت میں بھی آپ کو حقیقی آزادی حاصل ہوتی ہے؟ آزادی کا صحیح مفہوم نہ جاننے کے باوجود، آپ کا دل پکارے گا کہ اسے کسی شے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ وہ جس شے کی کمی محسوس کرتا ہے، وہی حقیقی آزادی کا جوہر ہے لیکن ہم چونکہ کبھی حقیقی آزادی سے لذت آشنا نہیں ہوئے، اس لئے ہمارا دل، اس احساس کے باوجود، یہ بتا نہیں سکے گا کہ کس چیز کی کمی ہے جسے وہ محسوس کرتا ہے ـــــ اور اصل تو یہ ہے کہ اس قسم کا احساس بھی کسی کسی دل میں ابھرے گا ـــــ اس دل میں جس میں ہنوز زندگی کی رمق موجود ہے، ورنہ سمجھنے سوچنے سے عاری قوم میں تو زندگی کا نقش تک بھی باقی نہیں رہتا۔ اسی کو قرآن جہنم سے تعبیر کرتا ہے۔ جب وہ (اہلِ جہنم کے متعلق) کہتا ہے کہ، لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا۔ (۷/۱۷۹) ان کے دل سمجھنے سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں اور محض گردشِ خون کا آلہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ وہ جہنم جس میں حالت یہ ہوتی ہے کہ؛ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيٰى۔ (۲۰/۷۴) اس میں نہ انسان زندہ ہوتا ہے نہ مردہ۔ مردہ اس لئے نہیں ہوتا کہ (غالبؔ کے الفاظ میں) اس کی رگوں میں خون گردش کر رہا ہوتا ہے۔ وہ ـــــ (CLINICALLY DEAD) نہیں ہوتا۔ اور زندہ اس لئے نہیں ہوتا کہ اس میں جوہرِ حیات، یعنی آزادی کا احساس تک باقی نہیں ہوتا۔

آزادی کی قیمت

اقبالؒ اسی آزادی کو خودی کہہ کر پکارتا ہے۔ اور کس قدر بصیرت افروز انداز میں کہتا ہے کہ ؎

اگر یک ذرہ کم گردد ز انگیزِ وجودِ من　　！　　باین قیمت نمی گیرم حیاتِ جاوداں را　　(زبورِ عجم)

ظاہر ہے کہ یہاں حیات سے مراد، نفس کی آمد و رفت یا خون کی گردش کی زندگی ہے۔ خواہ وہ (بزعمِ خویش) ابدی ہی

کیوں نہ ہو۔ وہ اس زندگی کی قیمت، اپنی آزادی (خودی) کے ایک ذرہ کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔ ایک غزل گو شاعر اسی حقیقت کو اپنے (رندانہ) انداز میں یوں بیان کرتا ہے کہ :۔

با احتیاط ز دستِ خضر پیالہ بگیر ، مبادا آبِ حیات بدہد بجائے شراب

آزادی کی حقیقت اسی قسم کے حساس قلوب جانتے اور اس کی قدر و قیمت پہچانتے ہیں۔

غیر قوموں کی محکومی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والوں کی طرف سے (ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے دوران) اس قسم کے الفاظ اکثر سننے میں آتے تھے (بلکہ ہر ایک کی زبان پر تھے) کہ انگریز ہندوستان کی ساری دولت لوٹ، سمیٹ کر اپنے ملک میں لے گیا ہے۔ ہمیں آزادی حاصل ہوگی تو ہم ایک پائی بھی باہر نہیں جانے دیں گے۔ اسی قسم کی آوازیں آپ (آجکل) پاکستان میں بھی سنیں گے کہ (زمانہ قبل از تقسیم ہند میں) ہندوؤں نے معاش کے سب دروازے مسلمانوں پر بند کر رکھے تھے۔ نہ انہیں ملازمتوں میں ان کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے حصہ ملتا تھا، نہ کاروبار میں ان کا کوئی عمل دخل تھا۔ ہم نے ہزار کوشش کی کہ ہندو اپنی اس خود غرضانہ مفاد پرستی کی روش تبدیل کرلے لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ اس سے ہمارے لئے کوئی اور چارۂ کار نہ رہا کہ ہم اس سے الگ ہو کر اپنی آزاد مملکت قائم کرلیں۔

اس سے آپ نے دیکھا کہ انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی لڑنے والے اہلِ ہند، اور ہندوؤں کے خلاف تحریکِ آزادی میں حصہ لینے کے (موجودہ مدعیوں) کے نزدیک، آزادی سے مفہوم تھا معاشی آزادی۔ اپنے ملک کے ذرائع پیداوار اور معاشی وسائل پر دوسروں کا قبضہ ہو تو غلامی اور محکومی، اور وہ اپنے کنٹرول میں ہوں تو آزادی۔ بالفاظِ دیگر ان کے نزدیک، انسانی آزادی کا سارا مسئلہ روٹی کا ہے۔ اس کی فکر وجہ پریشانی ہو تو غلامی۔ اس فکر سے نجات مل جائے تو آزادی۔ کمیونزم (یا سوشلزم) کے (نام نہاد) فلسفہ اور نظام کا مقصود و منتہیٰ یہی ہے۔ اقبالؒ کارل مارکس کے متعلق کہتا ہے :۔

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس ، بر مساواتِ شکم دارد اساس

لیکن اس قسم کی (سب سے بڑی) آزادی تو غلام کو حاصل ہوتی ہے۔ (واضح رہے کہ ہمارے دور میں جو کہا جاتا ہے کہ غلامی کو معدوم کر دیا گیا ہے تو اس سے درحقیقت مقصود غلامی کے لفظ یا اصطلاح کو معدوم کر دینا ہے۔ نفسِ غلامی آج بھی اسی طرح (بلکہ اس سے بدتر انداز میں) جاری ہے جس طرح قدیم زمانے میں۔ غلامی کی صرف شکلیں بدل ہیں۔ روح اسی طرح قائم ہے۔ یوں سمجھئے گویا عصرِ حاضر میں جیل خانوں کی عمارات کا نقشہ بدلا ہے۔ قیدی ان کے اندر...... اسی طرح محبوس اور مقید ہیں۔ غلام، اپنے آقا کے احکام کی تعمیل تو کرتا ہے لیکن اسے اس کی فکر نہیں ہوتی کہ اس کی روٹی کہاں سے آئے گی۔ اس کی فکر اس کے مالک کو ہوتی ہے یوں سمجھئے کہ غلام، روٹی کی فکر سے آزاد ہوتا ہے۔ (ہم نے جو اوپر کہا ہے کہ دورِ حاضر کا غلام —— یعنی محنت کش مزارعہ یا مزدور —— زمانۂ قدیم کے غلام کے مقابلہ میں بدتر غلامی کی زندگی بسر کرتا ہے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہے۔ قدیم زمانے میں مالک، اپنے غلام کو پیٹ بھر کر روٹی دیتا تھا۔ موجودہ دور کا مالک،

مزدور کو مقررہ اُجرت دیتا ہے۔ اسے اس سے غرض نہیں ہوتی کہ اس سے اس کا پیٹ بھی بھرتا ہے یا نہیں۔ بہرحال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ عصرِ حاضر کے مادی تصورِ حیات کی رو سے، آزادی کا مفہوم، معاشی آزادی میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان کے زندہ رہنے کے لئے روٹی ضروری ہے لیکن محض روٹی سے انسان کی وہی زندگی

روٹی کا مسئلہ

باقی رہتی ہے جسے ہم نفس کی آمد و شد یا خون کی گردش کی زندگی سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی انسان کی طبیعی زندگی۔ اتنی آزادی کو انسانی آزادی کہنا، انسانیت کی تذلیل ہے۔ روٹی کی فکر سے آزادی تو گدھے کو بھی حاصل ہوتی ہے۔ کمہار، علی الصبح اپنے گدھے کو لے کر نکلتا ہے۔ سارا دن گدھے کے ساتھ، اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر، مارے مارے پھرتا ہے۔ بلکہ اسے اکثر و بیشتر گدھے سے بھی زیادہ چلنا پڑتا ہے۔ شام کو دونوں گھر واپس آجاتے ہیں۔ گدھا اپنے تھان پر آرام سے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اسے اپنے چارے کی فکر نہیں ہوتی۔ وہ اس فکر سے آزاد ہوتا ہے۔ اس کی فکر، اس کے مالک کو ہوتی ہے۔ وہ اس کے لئے چارہ کی تلاش میں نکلتا ہے —— اور سچ پوچھئے تو گدھے کے مالک کو دوہری فکرِ معاش ہوتی ہے۔ ایک گدھے کے چارے کی فکر۔ دوسرے اپنے بیوی بچوں کی روٹی کی فکر۔ گدھا ان دونوں فکروں سے آزاد ہوتا ہے۔ یہی کیفیت (جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے) قدیم زمانہ کے محکوموں اور غلاموں کی تھی۔ فرعون کو انسانی آزادی کا سب سے زیادہ شدید گلا گھونٹنے والا سمجھا جاتا ہے۔ دنیا میں "فرعونیت" استبداد کے لئے ضرب المثل بن چکی ہے۔ لیکن فرعون اپنی محکوم اور غلام قوم —— بنی اسرائیل —— کو کس قسم کی روٹی دیتا تھا، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب صاحبِ ضربِ کلیم، حضرت موسیٰؑ اس قوم کو فرعون کی غلامی سے چھڑا کر، سینا کی آزاد فضاؤں میں لے گئے ہیں، تو انہیں وہاں، فرعون کی روٹیاں بار بار یاد آتی تھیں۔ وہ قدم قدم پہ روٹھ کر بیٹھ جاتے اور (حضرت موسےٰؑ) سے کہتے کہ تم ہمیں کس بیابان میں لے آئے ہو۔ توراۃ میں ہے:۔

> پھر وہ ایلیم سے روانہ ہوئے اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت زمینِ مصر سے خارج ہو کر دوسرے مہینے کے پندرھویں دن سین کے بیابان میں جو ایلیم اور سینا کے درمیان ہے پہنچی۔ اور ساری جماعت بنی اسرائیل کی اس بیابان میں موسےٰ اور ہارون پر جھنجھلائی۔ اور بنی اسرائیل بولے کہ کاش ہم خداوند کے ہاتھ سے زمینِ مصر میں جس وقت کہ ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھتے تھے اور روٹی من بھر کے کھاتے تھے مارے جاتے۔ کیونکہ تم ہم کو اس بیابان میں نکال لائے ہو کہ سارے مجمع کو بھوک سے ہلاک کرو۔ (خروج - $\frac{16}{1-3}$)

محکومی کے مستبد ترین دور میں بھی غلاموں کو اس انداز کی روٹی ملتی تھی!

لیکن فکرِ معاش کی طرف سے اس قدر آزادی کے باوجود، غلام اور محکوم کی زندگی کو آزادی کی زندگی کیوں نہیں کہا جاتا؟ اسے غلامی کی زندگی کیوں کہا جاتا ہے۔ عصرِ حاضر کے علمائے نفسیات (PSYCHOLOGISTS) نے غلامی اور آزادی کے اس فرق کو دو، نہایت مختصر الفاظ میں اس انداز سے واضح کر دیا ہے کہ اس سے دیدہ ور انسان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ آزادی کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک (FREEDOM FROM) یعنی طبیعی زندگی کی ضروریات کی فکر سے آزادی۔ ان کے حصول اور

آزادی کی دو قسمیں

(FREEDOM TO) استعمال میں پوری پوری آزادی۔ اور دوسری آزادی یعنی فکر و عمل کی آزادی۔ فیصلوں کی آزادی۔ انتخاب (CHOICE) کی آزادی۔ حسبِ منشا کام کرنے کی آزادی۔ وہ کہتے ہیں کہ انسانیت کی تاریخ اس حقیقت کی مظہر ہے کہ جب بھی کسی انسان یا انسانوں کے گروہ نے، دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں کسی طرح، زیادہ قوت حاصل کر لی، انہوں نے ان کمزور انسانوں کو (FREEDOM FROM) کی حد تک تو آزادی دے دی۔ انہیں فکرِ معاش کی طرف سے آزاد کر دیا۔ لیکن انہیں (FREEDOM TO) کی آزادی کبھی نہیں دی۔ انہوں نے انہیں فکرِ معاش سے اس لئے آزاد کر دیا۔ یعنی وہ انہیں روٹی اس لئے دیتے تھے تاکہ وہ زندہ رہیں اور ان کی خدمت کر سکیں۔ ان کے کام آئیں۔ اس آزادی سے انسان، حیوانات کی سطح پر اتار دیا جاتا تھا۔ یعنی جس طرح یہ بالادست فرد یا گروہ، اپنے گھوڑوں۔ بیلوں۔ بھیڑ بکریوں کی پرورش ضروری سمجھتا تھا تاکہ وہ ان کے کام آسکیں۔ اسی طرح وہ ان انسانوں کی پرورش بھی کرتا تھا تاکہ وہ ان کے مختلف کام سرانجام دینے کے قابل رہیں۔ اور جس طرح وہ، اپنے گھوڑوں، بیلوں، بھیڑ بکریوں کو اس کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جس طرح جی چاہے کریں، اسی طرح وہ ان انسانوں کو بھی اس کی آزادی نہیں دیتے تھے کہ وہ اپنی منشا کے مطابق جو چاہے کریں۔ بالفاظِ دیگر وہ انہیں (FREEDOM FROM) تو دیتے تھے (FREEDOM TO) کبھی نہیں دیتے تھے۔ اسی طرح جیسے آج، بل کا مالک، مزدور کو اُجرت تو دیتا ہے (تاکہ وہ بل میں کام کرنے کے قابل رہے) لیکن وہ اسے اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ بل میں اپنی مرضی کے مطابق کام کرے، یا بل کے نظم و نسق میں اس کا بھی کوئی عمل دخل ہو۔

تاریخ انسانیت اس بالادست طبقہ کو دو گروہوں میں تقسیم کرتی ہے۔ ایک گروہ وہ جو سیاسی غلبہ حاصل کر لیتا تھا۔ اسے حکمران طبقہ کہئے۔ دوسرا وہ جو مذہبی سیادت حاصل کر لیتا تھا۔ یعنی مذہبی پیشوائیت۔ زیردست انسانوں کو غلامی کی زنجیریں تو یہ دونوں طبقے پہناتے تھے لیکن، حکمران طبقہ کے مقابلہ میں، مذہبی پیشوائیت کی زنجیریں زیادہ محکم اور سخت ہوتی تھیں۔ مثلاً:-

حکمرانی اور مذہبی پیشوائیت

(۱) حکمرانوں (بادشاہوں وغیرہ) کو اپنا غلبہ و تسلط قائم اور مستحکم رکھنے کے لئے، پولیس اور فوج کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن مذہبی پیشوائیت کو ان میں سے کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ اس لئے کہ حکمرانوں کا تسلط محکوموں کے جسم پر ہوتا ہے اور مذہبی پیشوائیت کا استیلا ان کے قلب اور دماغ پر۔ حکمرانوں کے خلاف سرکشی کے جذبات دلوں میں ابھرتے، اور بعض اوقات بغاوت کی شکل میں ظاہر بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن مذہبی تسلط کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی شخص کے دل کی انتہائی گہرائیوں میں ذرا سا اختلاف کا شائبہ بھی کروٹ لے تو وہ ڈرتا ہے۔ روتا ہے۔ گڑگڑاتا ہے۔ معافیاں مانگتا ہے۔ منتیں مانتا ہے۔ کفارے ادا کرتا ہے۔ "نادیدہ خوف" اس کے اعصاب پر ایسی کڑی گرفت رکھتا ہے کہ وہ سر اٹھانے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا۔

(۲) حکمرانوں کو محکوموں (رعایا) کی روٹی کی فکر کرنی پڑتی ہے ۔ اگر انہیں روٹی ملنے میں کچھ توقف ہو جائے تو وہ شورش برپا کر دیتے ہیں ۔ لیکن مذہبی پیشوا ایں کہ لوگ ان کے پاؤں بھی چومتے ہیں اور ان کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ نعمتیں اور آسائشیں بھی مہیا کرتے ہیں ۔ خود بھوکے رہتے ہیں اور ان کی دعوتیں کرتے ہیں ۔ وہ اگر کبھی ناراض ہو جائیں تو ان پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے ۔ انہیں منانے کے لئے منتیں مانی اور چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں ۔ ان کی بارگاہ میں اپنے بچوں تک کو قربان کر دیا جاتا ہے ۔ اس قسم کی گرفت کی مثال دنیا میں اور کہیں نہیں مل سکتی ۔۔۔ وہ گرفت جو ان کی زندگی تک ہی محدود نہیں ہوتی ۔ ان کی ۔۔۔۔ موت کے بعد بھی بدستور قائم رہتی ہے ۔ لوگ ان کی سمادھیوں اور قبروں تک کو سجدے کرتے ہیں ۔

(۳) حکمرانوں کا تسلط نہ ابدی ہوتا ہے نہ غیر متبدل ۔ حکمران قومیں آتی ہیں ، جاتی ہیں ۔ کبھی ایک خاندان کی حکومت ہوتی ہے کبھی دوسرے کی ۔ کبھی ایک بادشاہ کا تسلط ہوتا ہے کبھی دوسرے کا ۔ کبھی ایک نظامِ حکومت برسرِ اقتدار ہوتا ہے کبھی دوسرا ۔ لیکن مذہبی حکمرانی غیر مختتم اور غیر متبدل ہوتی ہے ۔ آپ ہندوستان کی تاریخ پر غور کیجئے ۔ اس کی ہزاروں سال پر پھیلی ہوئی تاریخ میں کتنی قومیں آئیں اور چلی گئیں ۔ کتنی بادشاہتیں قائم ہوئیں اور ختم ہو گئیں ۔ کتنے نظام مسلط ہوئے اور بدلے گئے ۔ لیکن زمانہ قبل از تاریخ میں (ویدوں اور شاستروں کے زمانے میں) ہندو دھرم نے جسے شودر کہہ دیا وہ آج تک شودر چلا آتا ہے ۔ (کیونکہ شودر کا بیٹا ہمیشہ شودر ہوتا ہے) ۔ جسے برہمن کہہ کر ۔۔۔۔۔ لوگوں کے سر پر بٹھا دیا وہ آج تک برہمن ہے ۔ نہ شودر کی غلامی میں فرق آیا نہ برہمن کی حکمرانی میں ۔ اس قسم کی حکومت دنیا میں کسی کو نصیب نہیں ہو سکتی ۔

(۴) اور سب سے بڑی بات یہ کہ خود حکمرانوں کو بھی اپنے غلبہ و تسلط کے لئے مذہب کا سہارا لینا پڑتا ہے ۔ جب تک پنڈت ، کھشتری (راجہ) کے ماتھے پر اپنی تصویب و توثیق کا تلک نہ لگا دے ، وہ گدی پر نہیں بیٹھ سکتا ۔ مذہبی پیشوا اسے خدا کا اوتار اور ظل اللہ علی الارض قرار دیتے ہیں تو وہ رعایا سے اپنا حکم منواتا ہے ۔

ظہورِ اسلام کے وقت

آپ تاریخِ عالم پر نگاہ ڈالیئے ' وہ اسی کشمکشِ صید و صیاد کی الم انگیز داستان نظر آئے گی ۔ شکاریوں کے صرف جال بدلیں گے ۔ شکار کی ہوس نہ صرف یہ کہ بدلے گی نہیں ، بلکہ زمانہ کے ساتھ ' بڑھتی چلی جائے گی ۔ ظہورِ اسلام کے وقت انسان کے ان بندھنوں کی کیفیت کیا تھی ' اسے علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

بود انسان در جہاں انساں پرست ناکس و نابود مند و زیر دست

سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش بندہا در دست و پا و گردنش

کاہن و پاپا و سلطان و امیر بہرِ یک نخچیر صد نخچیر گیر

از غلامی فطرتِ او دوں شدہ نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ

یہ تھی انسان کی حالت جب حضورؐ نبی اکرم کا ظہور ہوا ۔ آپؐ کی بعثت کی جو غرض و غایت خود خدا نے بیان فرمائی ہے ہمارے نزدیک اس سے زیادہ انقلاب انگیز اور حریت بخش مقصد کوئی اور نہیں ہو سکتا ۔ فرمایا کہ یہ رسولؐ اس لئے آیا ہے کہ : وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷)

"یہ ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا جن میں نوعِ انسان جکڑے چلی آ رہی ہے۔ انسانیت کے سر پر سے ان بوجھل سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے نیچے وہ دبی ہوئی ہے۔" یہ، زندگی کو جکڑے رکھنے والی زنجیریں، اور شرفِ انسانیت کا کچومر نکال دینے والی سلیں کیا تھیں؟ دو لفظوں میں ——— بعض انسانوں کی دوسرے انسانوں پر حکمرانی، خواہ وہ ملوکیت کی فولادی جکڑ بندیوں کی شکل میں ہو یا مذہبی پیشوائیت کی فریب کارانہ سحر آفرینیوں کی صورت میں۔ انسان کو غلامی کی ان تمام نوعیتوں سے کامل آزادی دلانا، حضور نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد تھا۔ چند سالوں کے مختصر سے عرصہ میں یہ عظیم مقصد کس حسن و خوبی سے حاصل ہو گیا، تاریخ عالم اس کی شاہد ہے۔ غلامی کی یہ تمام زنجیریں ایک ایک کر کے توڑ دی گئیں اور انسان اس آزادی سے ہمکنار ہو گیا جو اس کا انتہائی مقصدِ حیات ہے۔

ہم نے شروع میں کہا ہے کہ آزادی کا لفظ تو ہر مقام اور ہر زبان میں ایک ایک سانس میں دہرایا گیا۔ اور دہرایا جاتا ہے، لیکن اس کا صحیح مفہوم بالعموم نگاہوں سے اوجھل رہا ہے۔ ہمارے زمانہ کے علم النفس کے ماہرین نے آزادی کا جو تصور پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ:-

ایسا نظام جس میں انسان کی مضمر صلاحیتیں پوری پوری نشو و نما پا سکیں۔ جس میں انسان، جنس (COMMODITY) بن کر نہ رہ جائے جسے خریدا جا سکے۔ جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے مقاصد بروئے کار لانے کا آلہ نہ بنے۔ ہر فرد کی انفرادیت قائم رہے۔

قرآنِ کریم نے اس عظیم مقصد کو دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے جب کہا کہ: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ۔ (۱۷/۷۰) یاد رکھو! ہر انسان، محض انسان ہونے کی بہت سے واجب التکریم ہے۔ بالفاظِ دیگر، آزادی سے مفہوم تکریم انسانیت ہے جو ہر فرد کا پیدائشی حق ہے۔ آدمیت احترامِ آدم است۔ بعثتِ محمدیہ نے اس نظریہ کو عملی پیکر عطا کر کے دکھا دیا۔

تکریمِ آدمیت

یہ بتایا جا چکا ہے کہ بالادست طبقہ کی ٹیکنیک یہ تھی کہ وہ رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں لے لیتے تھے اور اس کے نتیجے میں جب کمزور انسان روٹی سے محتاج ہو جاتے تو وہ ان سے اپنی من مانی منواتے۔۔۔۔ فرعون نے جب اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى۔ (۷۹/۲۴) کا دعویٰ کیا تھا تو پہلے یہ انتظام کر لیا تھا کہ وسائل و ذرائع پیداوار اس کے قبضے میں رہیں۔ چنانچہ وہ پورے دبدبہ فرعونیت کے ساتھ کہتا تھا کہ: اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ۔ (۴۳/۵۱) "اے لوگو! بتاؤ کہ ملک مصر اور اس میں جو نہریں بہتی ہیں، کیا میری ملکیت نہیں؟ یہ سب میری ملکیت ہیں اس لئے تمہیں اس کا اقرار کرنا پڑے گا کہ انا ربکم الاعلیٰ۔

رزق کی آزادی

قرآنِ کریم نے فرعون کے اس دعویٰ خداوندی کو بطور مثال بیان کیا ہے، ورنہ دنیا کا ہر فرعون اسی بنا پر دعویٰ خدائی کرتا ہے کہ وہ رزق کے سرچشمے اپنی ملکیت میں لے لیتا ہے۔ رزق کے سرچشموں میں زمین کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کے متعلق اعلان کر

دیا کہ اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ۔ زمین اللہ کی ہے۔ اس پر کسی انسان کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اسے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (۴۱/۱۰) ہر ضرورت مند کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کھلا رہنا چاہیئے۔ اس کی تشریح میں حضورؐ نبی اکرم نے اعلان فرمایا کہ:-

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں، اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے کھلی رہنی چاہیئے۔ (ابوداؤد)

اسی اعلانِ عظیم کا نتیجہ تھا کہ زمین پر ذاتی ملکیتیں ختم ہو گئیں اور زمیندار اور مزارع کی کوئی تفریق نہ رہی۔ آپ آجکل سود کی بحث کے بڑے چرچے سنتے ہوں گے۔ لیکن یہ بحثیں بینک کے سود تک محدود ہیں۔ یہ بات کوئی نہیں بتاتا، نہ اسے موضوعِ بحث قرار دیتا ہے کہ حضورؐ نبی اکرم نے زمین کی بٹائی (مزارعت) کے معاملہ کو بھی سودی کاروبار قرار دیا ہے۔ حضرت ابن ابی نعیمؓ کی روایت ہے کہ:-

(حضرت) رافع بن خدیج نے ایک زمین کاشت پر لی۔ وہ اس کی آبیاری کر رہے تھے کہ حضورؐ ادھر سے گذرے اور پوچھا کہ یہ کھیتی کس کی ہے اور زمین کس کی۔ رافع نے کہا کہ یہ کھیتی میرے بیج اور میری محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کا ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک حصہ فلاں خاندان کا جس کی یہ زمین ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم دونوں سودی کاروبار کر رہے ہو۔ لہٰذا، زمین صاحبِ زمین کو واپس کر دو اور اپنا خرچہ اس سے وصول کر لو۔ (ابوداؤد)

ایک اور روایت میں اس اصول کی مزید تشریح ان الفاظ میں آئی ہے کہ:-

رسول اللہؐ سے سوال کیا گیا کہ کیا زمین کا مالک کاشتکار سے تھوڑا بہت اناج بھی نہیں لے سکتا۔ فرمایا نہیں۔ پھر سوال کیا گیا کہ اچھا! خدا نہ سہی، بھوسہ تو لے سکتا ہے۔ فرمایا بالکل نہیں۔ (نسائی)

اس لئے کہ جب زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت ہو نہیں سکتی تو حقِ ملکیت کیسا؟ زمین خدا کی اور اس میں پیداوار کے تمام اسباب و عناصر بھی اسی کے عطا کردہ۔ پھر زمین کا نام نہاد مالک کس بات کا معاوضہ لیتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون! کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

وہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، میری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، میری نہیں، تیری نہیں

کہا جائے گا کہ سوشلزم کے نظام میں بھی تو زمین پر ذاتی ملکیت تسلیم نہیں کی جاتی۔ کیا یہ قرآنی نظام کے مماثل نہیں؟ میں اس کی وضاحت تو ذرا آگے چل کر کروں گا کہ (سوشلزم یا اس قسم کے دیگر معاشی نظاموں) میں، ذرائع وسائل کو اپنی تحویل میں لے کر کس طرح انسانی آزادی کا گلا گھونٹا جاتا ہے۔ اس وقت میں صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ قرآنی نظام میں سوال، ذاتی یا مملکت کی ملکیت کا نہیں۔ قرآنی نظام، تمام افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری لیتا ہے، اور وسائلِ پیداوار کو اس لئے اپنی تحویل میں لیتا ہے کہ ان سے وہ، اپنی اس عظیم ذمہ داری کو

پورا کر سکے۔ یہ ذمہ داری، سر شکم کیا، دنیا کے کسی نظام نے بھی آج تک اپنے اوپر نہیں لی۔ قرآنی نظام ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے قائم ہوتا ہے جنہیں خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ اس کا اعلان یہ ہے:۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (۱۱/۶)

زمین پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

اور اس کے لئے وہ افرادِ مملکت سے عہد کرتا ہے کہ:۔

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ۔ (۶/۱۵۲)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

نظامِ خداوندی کی یہی وہ ذمہ داری ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے حضورؐ نے فرمایا تھا کہ:۔

جس بستی میں کسی ایک شخص نے بھی اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا۔ اس بستی سے اللہ کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہو گیا۔ (مسندِ امام مالکؒ)

جن کی تحویل میں خزائنِ رزق کا نظم و نسق رہتا ہے، ان کے متعلق آپؐ نے فرمایا کہ:۔

جس شخص کو اللہ مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنا دے اور وہ لوگوں کی ضروریات اور احتیاجات کی طرف سے لاپرواہی برتے تو اللہ تعالےٰ اس کی ضروریات اور احتیاجات کی طرف سے لاپرواہی برتے گا۔

(ابوداؤد۔ کتاب الخراج)

دوسرے مقام پر ہے کہ:۔

حضورؐ نے فرمایا کہ جو امام، ضرورت مندوں، محتاجوں، مسکینوں پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور احتیاجات کے لئے آسمان کے دروازے بند کر دیتا ہے۔

(ترمذی۔ کتاب الاحکام)

اُس نظام میں جن لوگوں کو مسلمانوں کے امور کا نگران بنایا جاتا تھا، ان کی زندگی کس قسم کی ہوتی تھی اس کی تفصیلات میں، ہماری کتبِ روایات اور تاریخ بھری پڑی ہیں۔ میں یہاں دو ایک مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ ایک دفعہ مصر کا گورنر بابِ خلافت میں اُس وقت آیا جب حضرت عمرؓ کھانا کھا رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ کھانے میں جَو کی روٹی ہے۔ اس نے کہا کہ اب تو مصر سے کافی مقدار میں گیہوں آ رہا ہے۔ آپ گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے۔ آپؓ نے فرمایا کہ اس کا مجھے یقین ہے کہ اس وقت مملکت میں ہر فرد کو جَو کی روٹی میسر آ رہی ہے۔ جس دن آپ مجھے یقین دلا دیں گے کہ ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے اس دن میں بھی گیہوں کی روٹی کھا لوں گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ افرادِ مملکت تو جَو کی روٹی کھائیں اور سربراہِ مملکت گیہوں کی روٹی کھانے لگ جائے۔

جب آپ سے کہا گیا کہ آپ اس قدر عسرت کی زندگی بسر کر کے اپنے آپ کو مشقت میں کیوں ڈال رہے ہیں، تو آپ نے فرمایا کہ:۔

میں رعایا کی دیکھ بھال کیسے کر سکتا ہوں جب تک مجھ پر وہی کچھ نہ بیتے جو رعایا پر بیتتی ہے۔

جب آذربائیجان کا علاقہ فتح ہوا تو جیوشِ اسلامیہ کے سپہ سالار، حضرت حذیفہ بن فرقدؓ نے وہاں کی ایک خاص

مٹھائی کے دو ٹوکرے امیرالمؤمنین حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھیجے۔ آپ نے مٹھائی کو چکھا تو اسے بہت پسند فرمایا۔ لیکن اسے کھانے سے پہلے قاصد سے پوچھا کہ اس مٹھائی کو وہاں تمام سپاہیوں نے کھایا ہے؟ قاصد نے جواب دیا کہ نہیں! یہ تو صرف آپ کے لئے ہے۔ اس پر آپ نے عتبہ کو جو خط لکھا وہ ہمارے پیش نظر نکتہ کی بہترین تفسیر ہے۔ آپ نے لکھا:۔

اللہ کے بندے۔ امیرالمؤمنین کی طرف سے، عتبہ بن فرقد کے نام۔

امابعد۔ مرقد! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جو کچھ ہمیں اللہ نے عطا کیا ہے وہ نہ تمہاری ذاتی محنت اور مشقت کا نتیجہ ہے، نہ تمہارے ماں باپ کی محنت اور مشقت کا نتیجہ۔ (یہ تمام مسلمانوں کی مشترکہ محنت کا ثمرہ ہے)۔ اس لئے ہم کوئی ایسی چیز نہیں کھا سکتے جو تمام مسلمانوں کے گھروں میں کافی مقدار میں نہ ہو۔

قادسیہ کی عظیم فتح کی خوشخبری سننے کے بعد، آپ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ تاریخ کے صفحات پر آج تک سنہری حروف میں درخشندہ ہے۔ آپ نے کہا:۔

مجھے اس بات کی بڑی فکر رہتی ہے کہ جہاں بھی کسی کو ضرورت مند دیکھوں اس کی ضرورت پوری کر دوں۔ جب تک ایک دوسرے کی (انفرادی طور پر) مدد کرنے سے ایسا ہو سکے، ہمیں ایسا کرنا چاہیئے۔ جب معاملہ اس سے آگے بڑھ جائے تو ہمیں سب کو مل کر گذر اوقات کرنی چاہیئے۔ یہاں تک کہ سب کا معیار زندگی ایک جیسا ہو جائے۔ کاش! تم جان سکتے کہ میرے دل میں تمہارا کس قدر خیال ہے۔ لیکن یہ چیز میرے زبانی سمجھانے کی نہیں۔ عمل سے کرکے دکھانے کی ہے۔ خدا کی قسم! میں بادشاہ نہیں کہ تم لوگوں کو اپنا محکوم اور غلام بنا کر رکھوں۔ میں تو خود خدا کا محکوم اور غلام ہوں۔ حکمرانی کی یہ امانت میرے سپرد کی گئی ہے۔ اب اگر میں اسے اپنی ذاتی ملکیت نہ سمجھ لوں بلکہ تمہاری چیز تمہاری طرف لوٹا دوں اور تمہارے پیچھے تمہاری خدمت کے لئے چلوں یہاں تک کہ تم اپنے اپنے گھروں میں سیر ہو کر کھا پی سکو تو یہ وہ سعادت ہوگی جو تمہارے ذریعہ مجھے میسر آجائے گی۔ لیکن اگر میں اس امانت کو اپنا لوں اور تمہیں اپنے پیچھے پیچھے چلنے اور اپنے گھر پر آنے کے لئے مجبور کر دوں تو یہ وہ بدبختی ہوگی جو تمہارے ذریعہ میرے سر پر مسلط ہو جائے گی۔ (خدا مجھے اس سے محفوظ رکھے)۔

انہیں افرادِ مملکت کی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری کا کس قدر شدید احساس تھا، اس کا اندازہ ان کے اس اعلان سے لگایا جا سکتا ہے جس سے زیادہ جامع اعلان اور کہیں نہیں مل سکتا۔ آپ نے فرمایا کہ:۔

لوگو! اللہ نے مجھے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اس تک نہ پہنچنے دوں۔

یہ بات بڑی بلند اور لطیف ہے اس لئے ذرا وضاحت طلب ہے۔ مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ کسی فرد کی کوئی ضرورت نہ رُکی رہے تاکہ اسے اپنی اس ضرورت کے لئے خدا سے دعا کرنی پڑے — ظاہر ہے کہ جب کسی شخص کی کوئی ضرورت رُکی نہیں رہے گی تو اسے اپنی ضرورت کے لئے خدا کو پکارنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ بالفاظِ دیگر اگر کسی شخص کو اپنی کسی ضرورت کے لئے خدا سے کچھ مانگنے کی ضرورت پڑ جائے تو یہ گویا مملکت کے خلاف شکایت ہوگی کہ وہ اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے سے قاصر رہ گئی ہے۔

چنانچہ اس کی تفصیل میں طبری میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ :-

تمہارے اور اللہ کے درمیان میں پہلے اور میرے اور اللہ کے درمیان کوئی نہیں۔ اللہ نے میرے لئے ضروری قرار دیا ہے کہ میں اس کے حضور جانے والی دعاؤں کو روکوں۔ لہٰذا تم لوگ اپنی شکایتیں میرے پاس بھیجو۔ جو خود ایسا نہ کر سکے وہ کسی دوسرے آدمی تک اپنی بات پہنچا دے۔ تاکہ وہ اسے مجھ تک پہنچا سکے۔ اس کی شکایات پہنچنے پر ہم اس کا حق بغیر کسی تامل و تذبذب کے وصول کرا دیں گے۔ (طبری۔ حوادث ۱۴؁ھ)

اور یہ احساسِ ذمہ داری اپنے نقطۂ عروج پر اس وقت پہنچتا ہے جب حضرت عمرؓ کا وہ اعلان ہمارے سامنے آتا ہے جسے میں نے ایک عرصہ پہلے پیش کیا اور جسے (بحمدہٖ تعالیٰ) اب جگہ جگہ دہرایا جاتا ہے۔ یعنی یہ اعلان کہ :-

اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر جائے تو عمرؓ سے اس کی بھی بازپرس ہوگی۔[1]

یہ نظامِ معیشت جسے دنیا بالعموم ناقابلِ عمل سمجھتی ہے، جس محکم بنیاد پر قائم ہوتا ہے وہ اس اعلان کے آخری الفاظ میں پوشیدہ ہے۔ یعنی اگر ایسا ہو گیا تو عمرؓ سے اس کی بھی بازپرس ہوگی۔[2] خدا کے ہاں بازپرس کا احساس وہ احساسِ محکم ہے جس پر اس نظام کی سر بفلک عمارت استوار ہوتی ہے اور جس بنیاد کے نہ ہونے سے، کمیونزم اور سوشلزم کے بلند آہنگ دعوے ڈھول کی آواز بن کر رہ گئے ہیں۔ یہی وہ اساسِ محکم تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، علامہ اقبالؒ نے روس سے کہا تھا کہ :-

> اینکہ می خواہی نظامِ عالمے جستۂ او را اساسِ محکمے

اسی اساسِ محکم کا نتیجہ ہے کہ ذرائع رزق کے تمام وسائل اپنی تحویل میں رکھتے ہوئے، نظامِ قرآنی کے اربابِ حل و عقد فرعون بن کر انا ربکم الاعلیٰ نہیں کہتے اور اس طرح نہ کوئی فرد ان کا محتاج ہوتا ہے، نہ غلام۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

> کس دریں جا سائل و محروم نیست عبد و مولا۔ حاکم و محکوم نیست

یہ نکتہ ذرا تفصیل سے سمجھنے کا ہے۔ قرآن کریم نے اس نظام کی رو سے، افرادِ مملکت کی پرورش کو رحمت کہہ کر پکارا ہے۔ اور اسی میں اس کا سارا راز پوشیدہ ہے۔

رحمانی پرورش

لفظ رحمت کا مادہ (ر-ح-م) ہے۔ جس سے رحم کا تصور سامنے آتا ہے۔ رحمت اس اندازِ پرورش کو کہتے ہیں جس انداز سے رحمِ مادر میں جنین کی پرورش ہوتی ہے۔ یہ پرورش، کسی صلہ کی تمنا یا معاوضہ کی خواہش کی بنا پر نہیں ہوتی۔ اس کا جذبۂ محرکہ، جنین سے کچھ لینا نہیں ہوتا۔ دینا ہی دینا ہوتا ہے۔ ماں اپنا خونِ جگر پلا پلا کر اس بچے کی پرورش کرتی ہے۔ اور اس بچے کا، ماں کا احسان مند ہونا تو ایک طرف، اسے اس کا علم تک نہیں ہوتا کہ اس

---

[1] مزید تفاصیل کے لئے دیکھئے، میری کتاب "شاہکارِ رسالت" جو اسلامی نظام اور عہدِ فاروقی کا جنت نظیر نقشہ پیش کرتی ہے۔

[2] خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے اعمال کے نتائج کو خدا کی بازپرس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

کی پرورش کون کر رہا ہے۔ لہٰذا رحمت اس انداز پرورش کا نام ہے جس میں نہ پرورش کرنے والا کسی قسم کے صلہ یا معاوضہ کا متمنی ہوتا ہے نہ جس کی پرورش کی جائے، وہ کسی کا احسان مند۔ اور یہی وہ چیز ہے جس سے اس کی تکریم کو کوئی زد نہیں پہنچتی۔ احسان تو انسان کے شرف و تکریم کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رحمت کے انداز کی پرورش کرنے والے، اپنے پروردوں سے بصد خلوص کہتے ہیں کہ: لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۔ (۷۶/۹) اس سامانِ پرورش کا معاوضہ تو ایک طرف۔ ہم تو اس کے لئے تم سے شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں۔" یوں جسمانی پرورش کے ساتھ اس فرد کی انفرادیت بھی نشو و نما پاتی چلی جاتی ہے۔ اور اس سے اگلا نکتہ ہماری سمجھ میں آتا ہے۔

جنین، ماں ہی کے جسم کا ایک جزو ہوتا ہے۔ وہ بنتا ہی اس کے گوشت پوست، رگ و ریشہ اور خون سے ہے۔ ماں اور بچے کی وحدت (ONE-NESS) کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر ماں بیمار ہوتی ہے تو بچہ اسی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اگر ماں میں کسی اہم جزو (کیلشیم وغیرہ) کی کمی ہوتی ہے۔ تو بچے میں بھی وہ کمی پیدا ہو جاتی ہے۔ بچے میں اس کمی کو دور کرنے کے لئے ماں کی غذا میں اس جزو کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ مقصد ان مثالوں سے یہ بتانا ہے کہ ماں اور بچے میں، من تو شدم تو من شدی کا رشتہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بچہ اپنی الگ ہستی رکھتا ہے۔ اور ماں کی انتہائی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی جداگانہ، صحت مند ہستی لے کر دنیا میں آئے۔ یعنی ماں کے ساتھ (ONE-NESS) کے باوجود، بچے کی انفرادیت، اس کا جداگانہ تشخص، اس کی (INDIVIDUALITY) قائم رہتی ہے اور نشو و نما پاتی چلی جاتی ہے۔ یہ فرق ہے فرعونی نشو و نما اور رحمانی نشو و نما میں۔ فرعونی نظام میں، مدسروں کو روٹی تو دی جاتی ہے لیکن ان کی انفرادیت ختم کر دی جاتی ہے۔ يذبحون ابناءهم کے معنی یہی ہیں۔ فرعونی نظام یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی سر اٹھا کر چلے۔ کسی کی خودی پروان چڑھے۔ کسی کی انفرادیت قائم رہے۔ ان دونوں نظاموں میں یہی بنیادی فرق ہے جسے اقبالؒ نے ان جامع الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

آں خدا، نانے دہد، جانے دہد این خدا، نانے دہد، جانے برد

اور اسی سے قرآن کریم کی اس قلیل الالفاظ لیکن کثیر المعانی آیت کا مفہوم نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔

یہ، سورۃ الفرقان کی وہ آیۂ جلیلہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ: اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ۔ (۲۵/۲۶) اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ اس دور میں، اس نظام میں، حق پر مبنی اقتدار اور کنٹرول ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جو خدا کی صفتِ رحمانیت کے حامل ہوں گے۔ اس سے اس نظام کی بنیادی خصوصیت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ کنٹرول ان لوگوں کے ہاتھ میں جو افرادِ مملکت کی پرورش اور نشو و نما اس طرح کریں جس طرح رحمِ مادر میں جنین کی پرورش اور نشو و نما ہوتی ہے۔ اس اسلوبِ پرورش و نشو و نما کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ سورۃ فاتحہ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ الحمد للہ رب العالمین۔ الرحمٰن الرحیم۔ اور ان صفات اور خصوصیات کے بعد مالک یوم الدین۔

ہم نے شروع میں کہا تھا کہ آزادی کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ:-

انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما اس طرح ہوتی جائے کہ اس کی انفرادیت کو ٹھیس نہ لگے۔ اس کی تکریم اور احترام میں فرق نہ آئے۔ اس کی خودی (ذات) کی تکمیل ہوتی جائے۔

آپ دیکھئے کہ جس نظام کی پیامبری، حضورؐ نبی اکرمؐ نے فرمائی اور جسے عملی شکل میں آپؐ نے قائم کرکے دکھایا اس کے اس شعبہ میں بھی جس کا تعلق (بظاہر) انسان کی طبیعی پرورش سے ہے، کس طرح انسانی آزادی کو برقرار رکھا گیا ہے۔

گوشۂ حکمرانی

اب اس نظام کے دوسرے حصے کی طرف آیئے۔ یعنی وہ حصہ جسے عام الفاظ میں حکمرانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہم نے آزادی کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ اس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ ہو۔ اس کے اغراض و مقاصد کے بروئے کار لانے کا آلہ اور ذریعہ نہ بنے۔ ہر فرد کی انفرادیت مقصود بالذات ہو۔

قرآن کریم بتاتا ہے کہ انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے، اور یہ خصوصیت کائنات میں کسی اور کو حاصل نہیں۔ اسے (FREEDOM TO) کہا جائے گا۔ اس نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بتایا ہے کہ آدم (آدمی) کی ابتدائی زندگی ایسی تھی جس میں اسے فکرِ معاش سے آزادی حاصل تھی۔ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۔ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۔ (۲۰/۱۱۹-۱۱۸)

نہ بھوک پیاس کی طرف سے پریشانی۔ نہ لباس اور سردی گرمی سے بچنے کی فکر دامنگیر۔ ظاہر ہے کہ فرعونی معاشرہ میں اگر حکمران طبقہ رعایا کو رزق کی اس قدر فراوانی مہیا کر دے تو اس کی قیمت میں اس کے اختیار و ارادہ کو کلیتہً سلب کر لے گا۔ لیکن قرآن بتاتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے آدم کی اس صلاحیت کو سلب نہیں کیا۔ اسے پوری پوری آزادی دے دی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس نے خود حکمِ خداوندی سے سرتابی برتی۔ واضح رہے کہ انتخاب (CHOICE) اور ارادہ کی آزادی کے بغیر، خیر و شر یا نیکی بدی، کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا — حیوانات کو اختیار و ارادہ حاصل نہیں اس لئے ان کی زندگی میں خیر و شر کا تصوّر ہی نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اختیار و ارادہ اور عقل و شعور لازم و ملزوم ہیں۔ بہرحال، خدا نے انسان کو عقل و شعور اور اختیار و ارادہ کی صلاحیت عطا کی، اور خدا جو خصوصیت انسان کو عطا کرتا ہے اسے پھر واپس نہیں لیتا۔ اس لئے کوئی ایسا نظام اور مسلک جس میں انسانی اختیار و ارادہ سلب ہوتا ہو، اور اس کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت پر زد پڑتی ہو نظامِ خداوندی نہیں کہلا سکتا۔ یہیں سے (FREEDOM TO) کا سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس آزادی کی وضاحت دو لفظوں میں کر دی جہاں انسان کو مخاطب کرکے کہا کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۔ (۴۱/۴۰) تم اپنی منشا کے مطابق جو چاہو، کرو۔ تمہیں اس باب میں پوری آزادی حاصل ہے۔ جہاں تک عقل و فکر کا تعلق ہے، عام طور پر سمجھا اور کہا جاتا ہے کہ مذہب کے معاملہ میں عقل و فکر کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ایمان (جس کا انگریزی میں ترجمہ (FAITH) کیا جاتا ہے) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ آنکھیں بند کرکے مان لینے کا نام ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ ایمان (FAITH)

عقل و فکر کی آزادی

نہیں (CONVICTION) ہے۔ یعنی کسی دعوے کی صداقت کو عقل و فکر کی بنیاد اور دلائل و براہین کی تائید سے تسلیم کرنا۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں بتایا کہ مومن وہ ہیں کہ: وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا۔ (۲۵/۷۳) "جب ان کے سامنے آیاتِ خداوندی پیش کی جاتی ہیں تو وہ انہیں بھی اندھے بہرے بن کر تسلیم نہیں کرتے"۔ آپ دنیا کے کسی مذہب کو دیکھئے۔ اس میں اس کے بانی کو (خواہ اسے نبی یا رسول کہا جائے یا کچھ اور) فوق البشر (SUPER HUMAN) مانا جاتا ہے اور اس کے دعوے کی صداقت کے ثبوت میں فوق الفطرت کارنامے اس کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، جنہیں معجزات کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ معجزات سے مقصد ہی یہ لیا جاتا ہے کہ انسان کی عقل و فکر کو ماؤف کرکے اس سے اپنی بات منوائی جائے۔ لفظ معجزہ کے معنی ہی عقل کو عاجز کر دینے کے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جہاں عقل و فکر عاجز آجائیں وہاں اختیار و ارادہ سلب ہو جاتا ہے۔ ہپناٹزم میں کیا ہی یہ جاتا ہے۔

معجزات

مذہب کی دنیا کی یہ مسلّمہ روش چلی آ رہی تھی۔ لیکن یہ آزادی کا پیامبر آیا اور اس نے اس روش کے خلاف، ایک اور ہی انداز اختیار کیا۔ آپ قرآن کریم میں دیکھئے۔ آپ کی مخاطب قوم آپ سے بار بار معجزات کا مطالبہ کرتی ہے اور آپ ہر مطالبہ کے جواب میں کہتے ہیں کہ: اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔ "میں تو بھائی! تمہارے ہی جیسا انسان ہوں"۔ اس لئے تم مجھ سے فوق البشر کرشموں کا مطالبہ کیوں کرتے ہو؟ اس موضوع سے متعلق متعدد آیاتِ قرآنی میں سے صرف ایک مقام پر غور فرمایئے۔ سورۂ اسرائیل میں ہے کہ آپ کے مخالف آپ سے کہتے ہیں کہ ہم آپ کے دعوے کو کبھی تسلیم نہیں کریں گے جب تک آپ ایسا نہ کریں کہ ایک اشارہ سے زمین سے ایک اُبلتا ہوا چشمہ جاری کر دیں۔ یا کھجوروں اور انگوروں کے ایسے لہلہاتے باغات اگا کر دکھلائیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں۔ یا جیسا کہ تم بزعم خویش کہتے ہو، آسمان کا کوئی ٹکڑا ہم پر گرا کر دکھاؤ۔ یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لاکر کھڑا کر دو۔ یا تم اپنے لئے سونے کا ایک گھر نمودار کر دکھاؤ۔ یا ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ جاؤ اور پھر واپسی پر ایک لکھی لکھائی کتاب ساتھ لے کر آؤ۔ تم ایسا کرکے دکھاؤ تو ہم تمہارے دعوے کی صداقت کو تسلیم کر لیں گے۔

آپ کو معلوم ہے کہ ان مطالبات کے جواب میں آپ نے کیا فرمایا؟ کہا کہ: سُبْحَانَ رَبِّيْ۔ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ (۱۷/۹۳-۹۰) میرا خدا اس سے بہت بلند و بالا ہے کہ اس قسم کے فوق الفطرت اعجوبے دکھا کر اپنی بات منوائے۔ میں تو ایک انسان ہوں اور بس۔ اور فریضہ میرا یہ ہے کہ میں خدا کا پیغام تم تک پہنچاؤں۔ تم اس پیغام پر غور و فکر کرو اور پھر فیصلہ کرو کہ وہ ماننے کے قابل ہے یا نہیں۔ یہی نہیں کہ آپ نے ان کے مطالبات کے جواب میں ایسا فرمایا بلکہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ جس بات کو وہ خود آپ کا معجزہ مانتے تھے آپ نے اس کے معجزہ ہونے سے بھی انکار کر دیا۔ واقعہ یوں ہے کہ جس دن آپؐ کے صاحبزادہ (ابراہیم) کا انتقال ہوا، اتفاق سے اس روز سورج کو گہن لگ گیا۔ وہ تو خیر پھر بھی عرب کا ملک تھا اور آج سے چودہ سو سال پہلے کا تاریک زمانہ۔ اس قسم کا واقعہ اگر آج بھی کسی "روحانی پیشوا" کے ضمن میں رونما ہو جائے تو لوگ فوراً اس کے حضور عقیدتمندی

کا سر جھکا دیں۔ مختلف قبائل کے لوگ دوڑے دوڑے آئے اور کہا کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ واقعی خدا کے رسولؐ ہیں۔ کیونکہ آپؐ کے غم میں اجرامِ فلکی بھی سیاہ پوش ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی اور ہوتا تو اس واقعہ اور عوام کے ردِعمل کو ضرور (EXPLOIT) کر لیتا۔ لیکن آپؐ نے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ اگر کسی کے دل میں یہ خیال آیا ہے کہ میرے شریکِ غم ہونے کی وجہ سے سورج کو گہن لگا ہے تو اسے چاہیئے کہ ایسا خیال دل سے نکال دے۔ چاند اور سورج کو گہن فطرت کے اٹل قوانین کی رُو سے لگتا ہے۔ کسی کے مرنے جینے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ میں بھی تمہارے جیسا ایک انسان ہوں، اور میری اولاد بھی تمہاری اولاد جیسی ہے۔ اس لئے میرے بیٹے کی وفات کوئی ایسا خلافِ معمول واقعہ نہیں جس پر اجرامِ فلکی ماتم کریں۔ یاد رکھو!..... اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ۔

وہ آپ کے نہجِ زندگی کو دیکھ کر تعجب سے کہتے کہ، مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ۔ (۲۵/۷) یہ کس قسم کا رسولؐ ہے جو ہماری طرح کھانا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؛ اس کے جواب میں کہا جاتا کہ میں ہی ایسا رسول نہیں۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا — قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ۔ (۲۵/۲۰) مجھ سے پہلے بھی جتنے رسول خدا کی طرف سے آئے تھے، ایسے ہی تھے۔ وہ بھی میری طرح کھانا پیتے اور بازاروں میں گھومتے پھرتے رہا کرتے تھے۔ یہ تمہاری توہم پرستیاں اور انجوبہ پسندیاں ہیں جو تم نے انہیں فوق البشر بنا دیا ہے۔

بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ ہی سہی۔ لیکن انسان ہونے کی حیثیت سے بھی (مخالفین کی نگاہوں میں نہ سہی) اپنوں کی نگاہوں میں تو بہرحال حضورؐ کا بلند مقام تھا۔ لیکن آپؐ نے اپنی زندگی اس طرح گذاری کہ خود اپنوں کی نگاہوں میں بھی کسی قسم کے امتیازی تفوق کا تصور نہ پیدا ہونے پائے جو بعد میں جاکر فوق البشریت کی بنیاد بن جائے۔ صحیح سیرتِ نبویؐ کا ایک ایک ورق اس اندازِ زیست کی مثالوں سے ضوفشاں ہے۔ ہم اس مقام پر چند ایک مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ آپ ان واقعات کو سامنے رکھئے اور پھر اسوۂ نبویؐ اور سنتِ رسول اللہؐ کے اتباع کے دعویداروں کی زندگی پر نگاہ ڈالیئے۔ دونوں کا فرق اُبھر کر سامنے آجائے گا۔

حضورؐ کی زندگی

۱۔ ایک دفعہ کسی نے آپؐ سے خطاب کرتے ہوئے کہہ دیا۔ یا سیّدنا۔ (اے ہمارے آقا) اس پر آپؐ نے ڈانٹ کر کہا کہ دیکھو۔ تمہیں شیطان بہکا رہا ہے۔ آقا صرف خدا کی ذات ہے۔ میں تو عبداللہ کا بیٹا محمدؐ، خدا کا عبد اور اس کا رسول ہوں۔ آقائیت (سروری) صرف خدا کی ذات کے لئے ہے۔

۲۔ ایک شخص خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوا تو آپؐ کے مرتبہ بلند کے احساس سے کانپنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں۔ میں کوئی فوق الفطرت ہستی نہیں۔ میں ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی۔

۳۔ ایک دفعہ آپ تشریف لائے تو صحابہؓ تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ فرمایا کہ یہ عجمیوں کا دستور ہے۔ ایسا نہ کیا کرو۔ اس کے برعکس حضرت فاطمہؓ تشریف لاتیں تو آپؐ کھڑے ہو جاتے، کہ یہ تقاضائے شفقت تھا، تمیزِ بندہ و آقا نہیں تھی۔

۴۔ قبائل کے نمائندے اور دوسری سلطنتوں کے وفود آتے تو انہیں پہچاننے میں دقت ہوتی کہ اس مملکت کا حکمران کون ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر صحابہؓ نے مٹی کا ایک چبوترہ بنا دیا کہ آپؐ اس پر بیٹھا کریں۔ آپؐ نے دیکھا تو غصے سے چہرہ تمتما اٹھا۔ چبوترہ کو ٹھوکر مار کر گرا دیا اور فرمایا کہ تم لوگ گلے وہ امتیاز پیدا کرنے جسے مٹانے کے لئے میں آیا تھا! تم نے آج مٹی کا چبوترہ بنایا ہے، بعد میں آنے والے اسے تختِ حکومت میں تبدیل کر دیں گے۔

۵۔ ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے دیکھا کہ آپؐ اپنا جوتا مرمت کر رہے ہیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر کہا کہ لائیے جوتا میں گانٹھ دوں۔ ایک تبسم جنت فروش کے ساتھ فرمایا کہ نہ بھائی! ہر شخص کو اپنا کام آپ کرنا چاہیئے۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ (۵۳/۳۸) "کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا" خدا کا پیغام ہے۔

۶۔ مسجد نبویؐ کی تعمیر ہو رہی تھی تو آپؐ بھی دیگر رفقاء کے ساتھ مزدوروں کی طرح مٹی ڈھو رہے تھے۔ خندق کھد رہی تھی تو آپؐ بھی دوسروں کے ساتھ کدال چلا رہے تھے۔ دوستوں کی مجلس میں دعوت کا سامان تھا سب نے کام بانٹ لئے آپؐ نے فرمایا کہ میں جنگل سے لکڑیاں لاؤں گا۔ صحابہؓ نے تامل کیا تو فرمایا کہ میں امتیاز پسند نہیں کرتا۔ غزوۂ بدر میں سواری کے جانور کم تھے، اس لئے لوگ باری باری سوار ہوتے تھے۔ حضورؐ نے بھی اپنی باری مقرر کر رکھی تھی۔ جانثار صحابہؓ اپنی باری حضورؐ کی خدمت میں پیش کرتے تو آپؐ فرماتے کہ نہ تم مجھ سے زیادہ پیدل چل سکتے ہو، اور نہ میں تم سے کم ثواب کا محتاج ہوں۔ مجاہد، میدان میں جاتے تو جن کے گھروں میں پیچھے کوئی مرد نہ ہوتا، ان کے گھر کے کام آپؐ خود جا کر کر دیتے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی لونڈی بھی آپؐ سے کوئی کام کہہ دیتی تو اس کے لئے بھی اٹھ کھڑے ہوتے۔

۷۔ اب آگے بڑھیئے۔ بدر کے قیدیوں کو رسیوں سے جکڑا ہوا تھا۔ انہی میں آپؐ کے سن رسیدہ چچا عباسؓ بھی تھے حضورؐ نے ان کے کراہنے کی آواز سنی تو چہرہ غم آلود ہو گیا۔ رفقاء بھانپ گئے اور جا کر عباسؓ کی رسیاں ڈھیلی کر دیں۔ ان کے کراہنے کی آواز بند ہو گئی تو آپؐ نے اس کی وجہ دریافت فرمائی۔ صحابہؓ نے بتایا تو آپؐ سخت ناراض ہوئے۔ فرمایا کہ یا تو سب قیدیوں کی رسیاں ڈھیلی کر دی جائیں یا عباسؓ کی رسیاں بھی انہی کی طرح کس دی جائیں۔ اسی قسم کی تخصیص سے تو انسانیت تباہ ہوتی ہے۔

۸۔ اور وہ واقعہ بھی تو اسی جنگِ بدر کا ہے جس کے تصور سے روح وجد میں آ جاتی ہے۔ جنگ کے قیدیوں میں حضورؐ کے داماد، ابوالعاصؓ بھی تھے۔ فیصلہ کے مطابق ان قیدیوں کا زرِ فدیہ طلب کیا گیا تو آپؐ کی بیٹی (حضرت زینبؓ) نے کانچ کا ایک ہار بطور فدیہ بھیجا۔ ہار سامنے آیا تو گذشتہ تیس سال کے واقعات ایک ایک کر کے آپؐ کی نگاہوں کے سامنے آ گئے۔ یہ وہ ہار تھا جسے حضورؐ نے اپنے نکاح پر حضرت خدیجہؓ کو تحفتہً دیا تھا۔ حضرت خدیجہؓ نے یہی ہار حضرت زینبؓ کی شادی پر، الوداعی تحفہ کے طور پر بیٹی کے زیب گلو کیا تھا۔ کانچ کے اس ہار کی قیمت تو کیا ہو سکتی تھی، لیکن محبت و رفاقت کے مقدس جذبات کی ایک دنیا اس میں جھلمل کر رہی تھی۔ آپؐ فوج کے "کمانڈر انچیف" بھی تھے اور سربراہِ مملکت بھی۔ آپؐ بلا تامل

اس ہار کو باقی ذخیرہ سے الگ کر سکتے تھے۔ لیکن ایسا کرنے سے اصولِ مساوات کو زد پہنچتی۔ آپؐ نے مجلسِ مشاورت کو بتایا کہ اس ہار کی کیفیت کیا ہے اور کہا کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو اسے آپؐ کی بیٹی کو واپس دے دیا جا سکے۔ ان کی تصویب سے ہار واپس کیا گیا۔ اسوۂ محمدیؐ نے بتایا کہ جب جذبات تقاضائے عدل پر غالب آجائیں تو آبگینۂ مساوات چکنا چور ہو جاتا ہے۔

۹- اب اس باب میں اس واقعہ کو سامنے لائیے جو اس موضوع پر گویا حرفِ آخر ہے اور جسے اس کی اہمیت کے پیشِ نظر قرآن نے اپنے اوراق میں محفوظ کر رکھا ہے۔ وہ واقعہ متعلق ہے حضرت زیدؓ سے۔ حضرت زیدؓ ایک غلام تھے جنہیں حضورؐ نے آزادی عطا کی تھی۔ ایک غلام کا آزاد ہونا ہی کچھ کم باعثِ شرف نہ تھا کہ اس کے بعد آپؐ نے اُسے اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا اور اس کی پرورش خود اپنے گھر میں کی۔ اس کے بعد اس کی شادی بنو ہاشم کی ممتاز ترین خاتون، اپنی پھوپھی زاد بہن، حضرت زینبؓ سے کر دی۔ سوءِ اتفاق کہ وہ شادی کامیاب نہ ہو سکی اور حضرت زیدؓ نے بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کر لیا۔

آپ غور کیجئے کہ حضرت زیدؓ کا یہ ارادہ آپ پر کس قدر شاق گذرا ہوگا۔ آپؐ گئے اور حضرت زیدؓ سے کہا کہ:

أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ (۳۳/۳۷)

اپنی بیوی کو طلاق مت دو۔

غور فرمائیے کہ یہ کہنے والا کون ہے اور کہا کس سے جا رہا ہے! کہنے والا خدا کا رسولؐ ہے جس پر ایمان لائے ہیں (حضرت) زیدؓ مسلمان کہلاتے ہیں اور جس کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ "یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک تیرے فیصلوں کے سامنے اس طرح سرِ تسلیم خم نہ کریں کہ ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف گرانی محسوس نہ ہو"۔ کہنے والا سربراہِ مملکت بھی ہے جس کی رعایا میں سے حضرت زیدؓ ہیں۔ کہنے والا وہ محسن ہے جس نے (حضرت) زیدؓ کو غلامی سے آزاد کیا۔ کہنے والا بمنزلہ باپ کے ہے اور جسے کہا جا رہا ہے وہ بمنزلہ بیٹے کے۔ اور کہنے والا اس معزز خاتون کا برادرِ بزرگ بھی ہے۔

کہیے کہ اس کے بعد (حضرت زیدؓ) کو اس کی جرأت ہو سکتی تھی کہ وہ اس حکم کی خلاف ورزی کرتے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے کیا کیا۔ انہوں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ سوچئے کہ آج اگر کسی پیر کا مرید، کسی افسر کا ماتحت، کسی حاکم کا محکوم، کسی باپ کا بیٹا، کسی محسن کا احسان مند، کسی بڑے کا چھوٹا، ایسا کرتا تو کیا قیامت نہ برپا ہو جاتی۔ لیکن وہاں کیا ہوا؟ نہ ماتھے پر شکن آیا، نہ زیدؓ پر کوئی عتاب نازل ہوا، حتیٰ کہ باہمی تعلقات میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔ وہی زیدؓ وہی نبی اکرمؐ۔

۱۰- یہ تو پھر بھی ایک صحابیؓ کا واقعہ ہے۔ مدینہ میں بریرہ نامی ایک لونڈی تھی جو بوجہ آزادی اپنے شوہر (مغیث) سے الگ ہو گئی تھی (حضرت) مغیث کی درخواست پر حضورؐ نے بریرہ سے کہا کہ وہ اپنے شوہر سے الگ نہ ہو۔ ذرا سوچئے کہ اس لونڈی سے یہ بات کہنے والا کون ہے۔ لیکن وہاں تو حریت و آزادی کی ایسی تعلیم دے رکھی تھی کہ لونڈیوں تک کو اظہارِ خیال اور فیصلہ کی پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ بریرہ نے عرض کیا کہ کیا آپؐ ایسا کرنے کا حکم دے رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ حکم تو نہیں، محض مشورہ ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ پھر

معاف فرمائیے۔ میں اس مشورہ کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اور حضورؐ ایک تبسمِ حاجز فواد کے ساتھ تشریف لے گئے۔

آپ مذہبی پیشوائیت کی تاریخ پر نگاہ ڈالیے اور دیکھئے کہ انہوں نے کس طرح اپنے معتقدین کے قلب و دماغ کو اپنی معبودیت کے شکنجوں میں جکڑ رکھا تھا، اور اس کے بعد اس بطلِ جلیل کی زندگی کو دیکھئے جو "پیشوائیت" کے بلند ترین مقام پر فائز تھا، اور اندازہ لگائیے کہ حضورؐ نے عملی مثال سے کس طرح ان زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جن میں انسانی آزادی مقید چلی آ رہی تھی۔ مذہبی پیشوائیت کے متعلق قرآن میں ہے:۔ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (۹/۳۴) "ان پیشوایانِ شریعت اور ارباب طریقت کا حال یہ ہے کہ یہ سادہ لوح معتقدین کا مال ناجائز طور پر کھا جاتے ہیں اور بجائے اس کے کہ خدا کے راستے کی طرف ان کی راہ نمائی کریں، الٹے اس راہ میں سدِ راہ بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں"۔ حضورؐ نے اس اعلانِ خداوندی سے مذہبی پیشواؤں کے وجود کو اسلام کی سرزمین سے نکال باہر کیا۔ اور اس طرح نوعِ انسان کو ان زنجیروں سے رہا کر دیا جن میں انہوں نے انہیں جکڑ رکھا تھا۔

اب آیئے تعلیم حکمرانی کی طرف! ہم نے بتایا ہے کہ آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ ہو۔ اسی سے فرد کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پاتی ہیں۔ اس باب میں قرآن کریم نے ایک ایسا تصور یا نظریہ پیش کیا ہے جس کی مثال انسانی دنیا میں نہیں ملتی۔ اس نے کہا ہے کہ انسانی ذات کی صلاحیتوں کی نشوونما ان اقدار کی پابندی سے ہوتی ہے جو اسے خارج سے (منجانب اللہ) ملتی ہیں۔ پابندی ان اقدار کی ہے نہ کہ کسی انسان کے حکم کی۔ یہ اقدار خدا کی کتاب (قرآن مجید) میں محفوظ ہیں۔ اس اعتبار سے (قرآن کی اصطلاح میں) کہا جائے گا کہ حکمرانی خدا کی کتاب کی ہے۔ نہ کہ کسی انسان کی۔ اس باب میں قرآن کریم نے ایک ایسا عظیم انقلابی اعلان کیا ہے جس کی مثال عالمِ انسانیت میں کہیں نہیں ملتی اور جس نے انسانوں پر انسانوں کی حکومت کے تصور تک کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (۳/۷۹) "کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، کہ خدا اسے کتاب (ضابطہ قوانین)۔ حکومت یا نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہنا شروع کر دے کہ تم احکامِ خداوندی کی جگہ میری محکومیت اختیار کرو۔" اس میں آجکل کی اصطلاح میں) مذہب اور سیاست دونوں دوائر آ گئے۔ کتاب، بمنزل اوّل، نبی کو ملتی تھی لیکن اس کے بعد اس کی وارث اس کی امت بنتی تھی۔ (۳۵/۳۲) اس اعتبار سے صاحبانِ کتاب میں ایسے تمام لوگ آ گئے جو مذہب کے نام پر لوگوں سے اپنی اطاعت کراتے ہیں۔ اور حکومت کے دائرہ میں اربابِ اقتدار۔ ان دونوں سے آگے بڑھ کر وہ خود نبی کے متعلق بھی کہتا ہے کہ اسے بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ لوگوں کو اپنا محکوم بنائے۔ آیت کا اگلا حصہ ہے۔ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ۔ (۳/۷۹) اسے یہی کہنا چاہیے

خدا کی حکمرانی

کہ تم سب، اس کتاب کی اطاعت سے جس کی تم دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور جس پر غور و فکر سے اس کے معانی کی تہ تک پہنچتے ہو، ربانی بن جاؤ۔

آپ اس اعلانِ عظیم پر غور فرمایئے۔ اس نے تمام پیشوایانِ مذہب (حاملینِ کتاب) اربابِ اقتدار (سیاسی حکمرانوں) حتیٰ کہ خود نبیؐ کے متعلق بھی کہہ دیا کہ ان میں سے کسی کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے لوگوں سے اپنا حکم منوائے۔ ان کا فریضہ کتابِ خداوندی کی اطاعت کرنا، اور اطاعت کرانا ہے۔ اور بس۔ سوچئے کہ کیا اس سے بڑھ کر کوئی اور منشورِ آزادی بھی دنیا میں ہو سکتا ہے؟ نبیؐ اپنی اُمت سے کہتا تھا کہ: اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ..... (۷/۳) تم اس کتاب کا اتباع کرو جسے تمہارے رب نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اور اس کے سوا کسی کارساز کا اتباع مت کرو۔ وہ اپنی اُمت ہی سے یہ نہیں کہتا تھا بلکہ خود اپنے متعلق بھی کہتا تھا کہ: اِنْ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ..... (۶/۵۰) میں بھی اسی کتاب کا اتباع کرتا ہوں۔ آپ نے غور کیا کہ اس انقلابی اعلان کی رو سے، حکومت کسی انسان کی نہ رہی، حکومت صرف کتابِ خداوندی کی ہو گئی۔ ہمارے ہاں، آزادی کا منتہیٰ، قانون کی حکمرانی (RULE OF LAW) قرار دیا جاتا ہے۔ یہ اعلان چودہ سو سال پہلے، قرآن کریم نے فرمایا تھا۔ اس فرق کے ساتھ کہ دنیا میں، قانون (LAW) انسانوں کا وضع کردہ ہوتا ہے اس لئے قانون کی حکمرانی بھی بالواسطہ انسانوں ہی کی حکمرانی ہو جاتی ہے۔ اور قرآنی منشورِ آزادی میں قانون انسانوں کا وضع کردہ نہیں ہوتا۔ خدا کا نازل کردہ ہوتا ہے جس میں کسی انسان کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔

لیکن چونکہ اسلام، مذہب نہیں، دین (یعنی نظامِ حکومت) ہے اس لئے اس میں کتاب اللہ کی اطاعت، انفرادی طور پر نہیں ہوتی۔ ایک نظام کے تابع، اجتماعی طور پر ہوتی ہے۔ اس نظام کے اوّلین سربراہ خود حضورؐ نبی اکرم تھے اس لئے آپ سے کہا گیا کہ: فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (۵/۴۸) تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کرو۔ اس میں خود رسول اللہ کے اپنے معاملات بھی شامل تھے۔ اور حضورؐ نے فرمایا تھا کہ: اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۶/۱۵) اگر میں بھی قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کی سزا سے میں بھی مامون نہیں رہ سکتا۔ مجھے بھی اس کا خوف ہے۔" یعنی قانون سے مستثنیٰ خود حضورؐ کی ذات بھی نہیں تھی۔ تا بدیگراں چہ رسد! اسی لئے، حضورؐ نے اپنی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں فرمایا تھا کہ:۔

اے پیغمبرؐ کی بیٹی فاطمہؓ! اور اے پیغمبرؐ کی پھوپھی صفیہؓ تم خدا کے ہاں کے لئے کچھ کر لو۔ میں تمہیں خدا سے نہیں بچا سکوں گا۔

قانون کی حکمرانی کی انتہا یہ ہے کہ قانون نافذ کرنے والے کے اپنے جذبات بھی اس پر اثر انداز نہ ہوں۔ اس ضمن میں ایک ایسا واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے جو، بال کی طرح باریک اور تلوار کی طرح تیز ہے اور عدل کے تقاضا اور ذاتی جذبات کو اس طرح الگ کر کے دکھا دیتا ہے جس طرح افق کی لکیر کرۂ ارض کو متمیز کر دیتی ہے۔ حضورؐ نے ایک یہودی کو جرمِ قتل کی سزا میں، موت کا حکم سنایا۔ جلاد اس کے سر پر تلوار لئے کھڑا، آخری اشارے

کا منظر تھا کہ اتنے میں اس یہودی کی خورد سال بچی، روتی، چیختی، چلاتی، دوڑی دوڑی آئی اور حضورؐ کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ کر التجا کی کہ مجھے یتیم ہونے سے بچا لیجئے۔ اس کی آہ و فغاں اس قدر درد آلود تھی کہ حضورؐ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ صحابہؓ نے سمجھا کہ حضورؐ قتل کا حکم واپس لے لیں گے۔ لیکن آپؐ نے بچی کے سر پر محبت بھرا ہاتھ پھیرا، اور جلاد کو قتل کا اشارہ دے دیا۔ بعد میں صحابہؓ کے دریافت کرنے پر حضورؐ نے جو فقرہ ارشاد فرمایا وہ جذبات اور عدل کی کش مکش میں ابدی راہ نمائی کا حکم رکھتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اُس وقت محمدؐ بن عبداللہ کی آنکھ روتی تھی اور محمدؐ رسول اللہ کا ہاتھ خدا کا حکم نافذ کر رہا تھا۔

محمدؐ بن عبداللہ اور محمدؐ رسول اللہ میں یہی وہ نازک فرق ہے جس کا ملحوظ رکھنا، آزادی کا سنگِ بنیاد قرار پاتا ہے۔

اس مقام سے یونہی آگے نہ گذر جایئے۔ یہ نکتہ بڑا عمیق ہے۔ خارجی زنجیریں جو انسانی آزادی کو مفلوج کرتی ہیں محسوس اور مرئی ہوتی ہیں اس لئے ان کا احساس بھی جلدی ہو جاتا ہے اور ان سے چھٹکارا حاصل کرنا بھی نسبتاً آسان

جذبات کی مغلوبیت

ہوتا ہے لیکن بعض زنجیریں وہ ہیں جو نہ محسوس ہوتی ہیں، نہ مرئی لیکن وہ انسانی آزادی کو اس طرح سلب کر لیتی ہیں کہ شعوری طور پر اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ یہ زنجیریں انسان کے اپنے جذبات کی محکومیت کی ہیں جو غیر شعوری طور پر اس کے اعصاب کو مصلوب کر دیتی ہیں۔ تعلیمِ نبویؐ نے انسان کو ان زنجیروں سے بھی نجات دلائی۔ قرآن مجید میں ہے۔ أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً ..... (۴۵/۲۳) "کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا معبود بنا لیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ وہ علم و عقل رکھنے کے باوجود غلط راستوں پر چلتا رہا۔ اس کے سمجھنے سوچنے اور سننے کی صلاحیتیں مفلوج ہو گئیں۔ اس کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے۔" یہ بدترین قسم کی غلامی ہے جس میں انسان خود اپنے آپ کو مبتلا کر لیتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جو زنجیریں انسان خود پہن لے، ان سے اسے کون چھڑا سکتا ہے! لیکن ظہورِ نبویؐ نے انسان کی ان زنجیروں کو بھی توڑ کر رکھ دیا اور اس کی ذات کی اس طرح نشوونما کی کہ اس کے جذبات، عقل و فکر کے تابع کارفرما ہوں اور اس کی عقل و فکر قرآنی روشنی میں گامزن رہے۔ یہ ہے حقیقی آزادی جس سے حضورؐ نے نوعِ انسان کو ہمکنار کرایا۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ نظامِ خداوندی میں اطاعت، قوانین و اقتدارِ خداوندی کی ہے، کسی انسان کے حکم یا فیصلہ کی نہیں، نہ ہی انسانیت ساز قوانین کی۔ اطاعت کے عام معنی (OBEDIENCE) کئے جاتے ہیں لیکن

اطاعت کے معنی

لغتِ عربی اور خود قرآن کی رو سے اس کے معانی ایسے لطیف ہیں جنہیں ایک ماہر علم النفس ہی (APPRECIATE) کر سکتا ہے۔ جب کھجوریں پک جائیں اور اس طرح اپنے فطری تقاضا کی رو سے، درخت کی شاخ سے الگ ہو کر نیچے ٹپک پڑیں — یعنی انہیں توڑنے کے لئے خارجی قوت کی ضرورت نہ ہو — تو اس کیفیت کو عرب اطاعِ النخل سے تعبیر کرتے

تھے۔ لہٰذا، اطاعت کے معنی ہیں کسی کام کو اپنے اندرونی تقاضا کی رو سے سرانجام دینا۔ اس لئے طاعت کے معنی ہوتے ہیں کسی شئے کا وسیع ہو جانا۔ یعنی دل کی کشادگی سے کسی کام کو کرنا۔ اس سے فرماں پذیری (محکومیت) اور اطاعت کا فرق بین طور پر سامنے آ جاتا ہے۔ (ERICH FROMM) نے اس فرق کو دو لفظوں میں نہایت لطافت سے واضح کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ (VIRTUE IS SELF REALISATION- NOT OBEDIENCE) یعنی نیکی فرماں پذیری کا نام نہیں۔ (SELF REALISATION) کا نام ہے۔ انگریزی زبان میں نفسیات کی اس اصطلاح کے ترجمہ کے لئے اُردو زبان میں مرادف لفظ (یا اصطلاح) بمشکل مل سکے گی۔ اس سے مراد ہوتی ہے انسانی ذات کی نشوونما۔ اس کی مضمر صلاحیتوں کو مشہود بنا دینا۔ اس تصور یا نظریہ کو حقیقت میں تبدیل کر دینا۔[۲] علامہ اقبالؒ نے کہا کہ جو اعمال انسانی ذات کے استحکام کا موجب ہوں، انہیں نیک کہا جائے گا۔ جو اس میں ضعف پیدا کریں انہیں برے اعمال کہا جائے گا۔ یہی خیر و شر کا بنیادی مفہوم ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جن امور سے انسانی ذات کی نشوونما یا استحکام ہوتا ہے، انسانی ذات کسی خارجی حکم کی طرح ان کی پابندی نہیں کرتی۔ ان کی تعمیل اس کا اپنا تقاضا ہوتا ہے جس طرح پیاسے کا پانی پینا، کسی خارجی حکم کی تعمیل نہیں، اس کے داخلی تقاضا کی تسکین ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ اس عمیق نکتہ کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ ــــ شرع بر خیزد ز اعماقِ حیات ـــــ اور اس کی تشریح ان ابیات میں کہ ؎

فاش می خواہی اگر اسرارِ دیں ــ جز بہ اعماقِ ضمیرِ خود مبیں
گر نہ بینی دیں تو مجبوری است ــ ایں چنیں دیں از خدا مہجوری است

(مثنوی ــ پس چہ باید کرد)

لہٰذا، احکامِ دین کی تعمیل سے انسانی آزادی سلب نہیں ہوتی۔ اس میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے قرآنِ مجید میں ہے کہ: وَلَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ (۲/۲۸۶) خدا کی طرف سے انسان پر جو پابندیاں عائد کی جاتی ہیں تو اس لئے نہیں کہ اس کی آزادی محدود و مقید ہو جائے۔ ان سے اس کی ذات کے اختیار کی وسعتیں اور بڑھ جاتی ہیں۔ جس طرح نہر کی ٹھوکر (FALL) سے مقصد نہر کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرنا نہیں ہوتا۔ اس کی روانی میں مزید تیزی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ ان پابندیوں کی خلاف ورزی سے انسانی ذات میں اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے۔

تزکیۂ نفس کا مفہوم

قرآنِ مجید نے حضور نبی اکرمؐ کا فریضہ رسالت ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ: وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ۔ (۲/۱۲۹) یہ رسول، کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور افرادِ انسانیہ کی ذات کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ یعنی یہ رسول، لوگوں کو اقدار و احکامِ خداوندی کی غرض و غایت، دلائل و براہین کی رو سے سمجھاتا ہے اور

---

۱ (PSYCHOLOGY AND RELIGION) (p.360

۲ (REALISE) کے معنی ہیں (TO MAKE REAL)

اس طرح ان کی ذات کا اس طرح تزکیۂ نفس کرتا ہے کہ ان احکام کی تعمیل ان کا اندرونی تقاضا بن جاتا ہے[1]۔ یہی دین کی لم ہے۔ اس کے معاشی نظام کی اساس محکم بھی یہی ہے۔ اس کا اصل الاصول ہے، یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ۔ قُلِ الْعَفْوَ۔ (۲/۲۱۹) "اے رسولؐ! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کی ضروریات کے لئے دے دیں، ان سے کہو کہ جتنا تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہو، وہ سب"۔ دین کی لم سے ناآشنا ذہنیتوں کی طرف سے اعتراض ہوتا ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ انسان جان مار کر محنت کرے اور اس کے ماحصل میں سے بقدرِ اپنی ضرورت کے رکھ کر، باقی سب دوسروں کے لئے دے دے۔ اگر اسے اس میں سے اتنا ہی دیا جائے گا تو وہ جان مار کر محنت کیوں کرے گا۔ وہ اتنا ہی کمائے گا جس سے اس کی اپنی ضروریات پوری ہوں۔ پھر اس کا تعین کون کرے گا کہ اس کی ضروریات کیا ہیں؟ اس قسم کے اعتراضات، مغرب زدہ ذہنوں کی طرف

قلِ العفو کا مفہوم

ہی سے مائل نہیں ہوتے۔ اقامتِ دین کے مدعیوں کی طرف سے بھی ہوتے ہیں، جو کہتے ہیں کہ انسان سے اس قسم کا تقاضا کرنا، اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ (یہ اس لئے کہ ان حضرات کا "دین" بھی دورِ حاضر کے نظامِ سرمایہ داری کا وضع کردہ ہے)۔ انہیں کون سمجھائے کہ قلِ العفو پر ایمان رکھنے والے ایسا کچھ کسی خارجی دباؤ کے ماتحت نہیں کرتے، یہ ان کی ذات کا تقاضا ہوتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں یُؤْتِیْ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی۔ (۹۲/۱۸) وہ اپنی محنت کی کمائی اس لئے دوسروں کو دے دیتا ہے کہ اس سے اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس انداز کے تعمیلِ احکام کو "استجاب" کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی کسی کے بلاوے پر لبیک کہنا۔ ظاہر ہے کہ لبیک کی آواز انسان کے دل سے ابھرتی ہے۔ مال دینا تو ایک طرف، وہ تو جان دینے کی دعوت پر بھی لبیک کہتے ہوئے کفن بردوش آگے بڑھ جاتا ہے۔ سورۃ انفال کی اس آیۂ جلیلہ پر غور کیجئے جس میں کہا گیا ہے کہ، یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ۔ (۸/۲۴) "اے ایمان کے مدعیو! تم اللہ اور رسولؐ کی دعوت پر لبیک کہو، جب وہ رسولؐ تمہیں اس امر کی طرف بلائے جو تمہیں حقیقی زندگی عطا کر دے گا"۔ اس آیت میں "استجیبوا" کا انگریزی زبان میں ترجمہ (RESPOND) کیا جاتا ہے جو صحیح ہے۔ (DUTY) اور (RESPONSIBILITY) میں یہی فرق ہے (RESPONSIBILITY) تو نام ہی (RESPONSE) کا ہے۔ یہ ہے اساسِ محکم قرآن کے معاشی نظام، قلِ العفو کی۔ حضورؐ نبی اکرمؐ کی مکی زندگی کو چھوڑیئے۔ مدنی زندگی میں ایک مملکت وجود میں آ گئی تھی جو قریب دس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی اور حضورؐ اس مملکت کے سربراہ تھے۔ مولانا شبلی کے الفاظ میں:-

یہ وہ زمانہ تھا جب تمام عرب، حدودِ شام سے لے کر عدن تک فتح ہو چکا تھا۔ اور مدینہ کی سرزمین میں

---

[1] تزکیۂ نفس کے معنی ہیں انسان کی ذات کی نشوونما کرنا جو علم و عقل کی رہنمائی سے بروئے کار آتا ہے۔ لیکن جب یہی "تزکیۂ نفس" خانقاہوں میں پہنچتا ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہو جاتا ہے، علم و عقل کا گلا گھونٹ کر انسانی ذات (نفس) کو فنا کر دینا۔ تصوف کا منتہیٰ فنائے خویش ہے۔ اور اسی لئے وہ علم و عقل کے پیچھے لٹھ لئے پھرتا ہے۔

زر و سیم کا سیلاب آ چکا تھا۔ (سیرۃ النبیؐ - جلد اوّل - صفحہ ۵۲ - ۳۴۹)

حضورؐ کی زندگی

لیکن اس کے باوجود، اس سربراہِ مملکت کی زندگی کا یہ نقشہ تھا کہ:-

حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ آپ کا کوئی کپڑا تہ کر کے نہیں رکھا گیا۔ صرف ایک جوڑا ہوتا تھا۔ دوسرا نہیں ہوتا تھا جو تہ کر کے رکھا جاتا۔ جن کپڑوں میں آپ نے وفات پائی ان میں اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے۔ (ایضاً)

مسلم کی ایک روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا کہ:-

آنحضرت صلعم نے نہ کوئی درہم چھوڑا نہ دینار۔ نہ بکری نہ اونٹ۔ اور نہ کسی چیز کی وصیت کی۔

اسی طرح بخاریؒ کی ایک روایت ہے کہ:-

رسول اللہؐ نے اپنی وفات کے وقت نہ دینار چھوڑا نہ درہم۔ نہ غلام نہ لونڈی۔ اور نہ کوئی اور چیز سوائے اپنے خچر اور ہتھیاروں کے۔

سوال یہ ہے کہ ایک وسیع و عریض مملکت کے اس سربراہ کو کس نے حکم دیا، اور کس نے مجبور کر رکھا تھا کہ وہ سب کچھ ہوتے ہوئے، اس قسم کی عسرت کی زندگی بسر کریں اور (دنیاداروں کے الفاظ میں) ایسی ناداری کی حالت میں وفات پائیں! آپ کو کسی نے اس کے لئے مجبور نہیں کیا تھا، نہ ہی یہ کسی خارجی حکم کی تعمیل تھی۔ یہ حضورؐ کی اپنی ذات کا تقاضا تھا۔

اور جن خوش بخت انسانوں کا آپ نے تزکیۂ نفس فرمایا تھا ان کی کیفیت یہ تھی کہ حضرت عمر رضؓ کے زمانے میں

حضرت عمر رضؓ کی مثال

اس مملکت کا رقبہ، بیس لاکھ مربع میل پر پھیل چکا تھا اور ایک عراق کی مالگذاری ساڑھے گیارہ کروڑ درہم تھی۔ اس کے باوجود جب آپ سے پوچھا گیا کہ مملکت کی آمدنی میں سے آپ کے لئے کس قدر لینا جائز ہے تو فرمایا کہ:-

کپڑوں کے دو جوڑے ایک جاڑے کا ایک گرمی کا۔ حج اور عمرہ کے لئے ایک احرام۔ اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے ویسا ہی آتا کھانا جو قریش کے ایک فرد کی خوراک ہے۔ نہ اس سے زیادہ، نہ اس سے کم۔ اس کے بعد میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں۔ جو ان کا حال سو میرا حال۔ (عمر فاروق رضؓ - از ہیکل)

کھانے پینے تک میں ضروریات کا تعین کس طرح ہوتا تھا اس کا اندازہ مملکتِ اسلامیہ کے ایک اور سربراہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے ایک واقعہ سے لگائیے:-

ایک دن آپ نے کھانے کے بعد بیوی سے کہا کہ کوئی میٹھی چیز ہو تو دیجئے۔ اس نے کہا کہ بیت المال سے جو راشن آتا ہے اس میں میٹھی چیز شامل نہیں..... بات آئی گئی ہو گئی۔ ہفتہ عشرہ کے بعد آپ نے دیکھا کہ کھانے کے ساتھ تھوڑا سا حلوہ بھی ہے۔ آپ نے بیوی سے کہا کہ تم نے تو کہا تھا کہ راشن میں میٹھی چیز نہیں آتی۔ یہ حلوہ کیسے پک گیا؟ اس نے کہا کہ میں ان دنوں مٹھی بھر آٹا الگ رکھتی گئی۔ جب وہ کافی ہو گیا تو اس کے عوض بازار سے کھجور کا شیرہ منگا لیا اور حلوہ پکا لیا۔ آپ کھانے سے فارغ ہو کر سیدھے بیت المال گئے اور راشن بانٹنے والے سے کہا کہ ہمارے ہاں جس قدر روزانہ آٹا دیا جاتا ہے اس

میں ایک مٹھی کی کمی کردی جائے۔ کیونکہ تجربے نے بتایا ہے کہ آٹے کی موجودہ مقدار ہماری روزانہ ضرورت سے بقدر ایک مٹھی کے زیادہ ہے۔

ہمیں یہ باتیں آج افسانہ سی نظر آتی ہیں۔ لیکن یہ افسانے نہیں حقیقتیں ہیں۔ جب دین کے تقاضے اعماقِ قلب سے ابھریں تو اس میں یہ سب کچھ ممکن ہو جاتا ہے۔ دین کا قیام انہی افراد کے ہاتھوں عمل میں آسکتا ہے جن کی ذات میں اس قسم کا تغیر آچکا، اور جن کے قلب ونگاہ میں ایسی تبدیلی پیدا ہو چکی ہو۔ اس حقیقت کو وہ لوگ کس طرح سمجھ سکتے ہیں جن کے نزدیک دین نام ہو چند فقہی قوانین کے رائج اور چند شرعی سزائیں نافذ کرنے کا! اسی بنا پہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ —— نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر! دین کے قیام کے لئے عرصۂ نبوت کا قریب ساٹھ فی صد حصہ (حضورؐ کی مکی زندگی کے تیرہ سال) افرادِ اُمت کے قلب ونگاہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے میں صرف ہو گیا تھا۔ (آج اسے چند نعروں سے برپا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے)۔

نہ ہی اس راز کو وہ لوگ پا سکتے ہیں جو سرے سے انسانی ذات ہی کے قائل نہیں اور اس کی زندگی کو … (حیوانی زندگی کی طرح) طبیعی زندگی قرار دیتے ہیں اور بس۔ اس کا نتیجہ تھا کہ مارکسؔ نے یہ نظریہ تو پیش کر دیا کہ انسان کی معاشی مشکلات کا حل اسی صورت میں ممکن ہے جب اس اصول کو اپنایا جائے کہ ہر ایک سے اس کی استعداد کے

مارکسؔ کی ناکامی

مطابق کام لیا جائے اور اس کی ضروریات کے مطابق دیا جائے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ اس اصول پر عمل کس طرح کیا جائیگا تو وہ لاجواب ہو گیا۔ حتیٰ کہ اسکی اپنی پارٹی کے لوگ جب اس سے یہ سوال کرتے تو وہ (ان کے تقاضوں سے تنگ آکر) جھلا اُٹھتا اور کہتا کہ اس مشکل کا حل تو بہرحال یہی ہے لیکن میں کہہ نہیں سکتا کہ اس پہ عمل کس طرح ہوا جا سکے گا۔ مارکسؔ کے بعد جب لینن سے یہی سوال کیا گیا تو وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا کہ:

> نوعِ انسان کن مراحل سے گذر کر اور کن عملی اقدامات کی رو سے اس بلند مقصد کو حاصل کر سکے گی، اس کی بابت ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ اس کیلئے ہمارے پاس کوئی مواد ایسا نہیں جس سے ان سوالات کا جواب دیا جا سکے جلد

انہوں نے اسی وجہ سے، کمیونزم کی جگہ سوشلزم کا نظام نافذ کیا لیکن چونکہ اس میں ایسا کچھ ڈنڈے کے زور سے کرایا جاتا ہے محنت کش کے دل کی گہرائیوں سے اس کے تقاضے نہیں ابھرتے۔ اس لئے وہ نظام بھی ناکام رہ گیا ہے۔ جس نظام میں بھی انسان کی عقل وفکر کے چراغ گُل کر دیئے جائیں اور اس کی آزادی سلب یا ماؤف ہو جائے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ دنیا جو جی میں آئے کر دیکھے۔ اسے اپنے ناکام تجربات کے بعد، آخر الامر اس نظام کی طرف آنا پڑے گا جسے وحیِ خداوندی کی روشنی میں، انسانی آزادی کے سب سے عظیم علمبردار، محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے عملاً قائم کر کے دکھا دیا تھا وہ نظام جس کی بنیاد تکریم و احترامِ آدمیت پہ استوار تھی۔ جس میں کیفیت یہ تھی کہ ایک جنگ میں قبیلہ طئے کی ایک لڑکی قیدی کی حیثیت سے گرفتار ہو کر حضورؐ کے سامنے آئی تو اس کا سر ننگا تھا۔ آپؐ نے دیکھا تو تلملا اُٹھے۔ ادھر اُدھر نظر دوڑائی تو کوئی فالتو کپڑا دکھائی نہ دیا۔ آپؐ نے خود اپنی چادر اُٹھائی اور نہایت شفقت سے اُسے اوڑھا دی۔ آپؐ اس ردائے مقدس سے اس کا سر ڈھانپ رہے تھے اور فضائے عالم میں یہ نشیدِ جانفزا گونج رہی تھی کہ:

برتر از گردوں مقامِ آدم است
اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

جلد مزید تفصیل اور حوالوں کے لئے دیکھئے میرا پمفلٹ "جہاں مارکسؔ ناکام رہ گیا۔ اس سے آگے"۔

حضورؐ کو اس کا علم و احساس تھا کہ جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو انسانی آزادی، مذہبی پیشوائیت کی خود ساختہ خدائی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (۹/۳۱) علماء اور مشائخ مقامِ الوہیت پر فائز اور مسندِ خداوندی پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ ان کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں سے اپنے احکام کو، اپنے احکام کہہ کر نہیں منواتے۔ وہ ان احکام کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ ان کے اسلاف سے متواتر چلے آئے ہیں اس لئے ان کے مبنی برحق و صداقت ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم نے اس باطل نظریہ کو یہ کہہ کر جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیا کہ حق و باطل کا معیار خدا کی کتاب ہے، نہ کہ کسی کا قول و عمل خواہ وہ کتنی ہی صدیوں سے متواتر کیوں نہ چلا آ رہا ہو۔ کوئی غلط فیصلہ، مرورِ زمانہ سے صحیح نہیں بن جاتا۔ وہ غلط ہی رہتا ہے خواہ وہ ہزاروں سال سے متواتر

اسلاف پرستی

کیوں نہ چلا آ رہا ہو۔ قرآن کریم میں ہے، وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا۔ "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم منزل من اللہ کتابِ خداوندی کا اتباع کرو، تو یہ لوگ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم اپنے اسلاف کے مسلک پر کاربند رہیں گے۔" خدا کی طرف سے جواب آتا ہے کہ، اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ۔ (۳۱/۲۱) اسلاف کے مسلک کے پردے میں خواہ انہیں شیطان جہنم کی طرف کیوں نہ بلا رہا ہو، یہ بلا دیکھے بھالے اسی مسلک پہ چلتے جائیں گے؟ کیا کہنے ہیں ان کی عقل و فکر کے! اللہ تعالیٰ نے حضورؐ پر واضح کر دیا تھا کہ ایسا کچھ کسی ایک رسول کے ساتھ نہیں ہوا۔ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ۔ (۴۳/۲۳) تم سے پہلے جو رسول بھی آیا اس کے ساتھ یہی ماجرا گذرا کہ مذہب پرست طبقہ نے اس کی دعوت کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ہم نے اپنے اسلاف کو جس مسلک پر چلتے دیکھا ہے، ہم اسی مسلک پر چلتے جائیں گے۔ یہ اس لئے کہ اس مسلک پر چلنے سے انہیں محنت مشقت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ مفت میں عیش کی زندگی بسر ہوتی تھی اور کتاب اللہ کے اتباع میں خود کما کر کھانا پڑتا تھا۔ ان کا مسئلہ سارا روٹی کا ہے۔ خود حضورؐ کے زمانے میں بھی یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آ گئی۔ قریش اور دیگر عربی قبائل، جو آپؐ کی دعوت کے اس قدر شدید مخالف تھے، رفتہ رفتہ اسلام لاتے گئے، لیکن مذہبی پیشواؤں کے فریب خوردہ، عیسائیوں، یہودیوں اور مجوسیوں میں سے بہت کم اس کے حلقہ بگوش ہوئے۔ حضورؐ نے جو نظام قائم فرمایا تھا اس میں مذہبی پیشواؤں کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔

ہم نے غلامی کی بہت سی شکلوں کا ذکر کیا ہے جن سے بعثتِ نبویؐ نے نوعِ انسان کو نجات دلائی۔ لیکن ابھی ایک شکل کا ذکر کرنا باقی ہے جو، اگرچہ چلی تو آتی تھی زمانہ قدیم سے لیکن اس نے انتہائی شدت ہمارے زمانے میں اختیار کی ہے۔ وہ غیر مرئی ڈکٹیٹر جس کی ہم بلا سوچے سمجھے، اور بلا چون و چرا اطاعت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، وہ ہے جسے عام الفاظ میں PUBLIC OPINION کہا جاتا ہے۔

PUBLIC OPINION

یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ ہم سب غیر شعوری طور پر اس آمرِ مطلق کے محکوم و اطاعت گذار رہتے ہیں لیکن ہم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں! کوئی غیر محسوس اور غیر متعین خوف ہوتا ہے جس کی وجہ سے ہم آنکھ بند کئے اس کی اطاعت کئے جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے اپنی انقلاب آفریں تعلیم سے اس غلامی کی بھی

زنجیریں کاٹ دیں۔ اس نے کہا کہ: وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ اگر تم نے عوام (MASSES) کی آواز پر کان دھرا اور ان کے پیچھے لگ گئے تو یاد رکھو وہ تمہیں خدا کی طرف لے جانے والے راستے سے بھٹکا دیں گے: اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ۔ (۶/۱۱۶) اس لئے کہ یہ لوگ تحقیق و تفتیش کے بعد کوئی راستہ اختیار نہیں کرتے۔ محض ظن و تخمین کے پیچھے ہو لیتے ہیں اور قیاس آرائیوں سے کام لیتے ہیں۔ عوام کی روش محض بھیڑچال ہوتی ہے۔ اس لئے نہ ان کا مسلک، علم و یقین پر مبنی ہوتا ہے، نہ ان کے نعرے حق و صداقت کی آوازیں۔ اس لئے ان سے متاثر اور مغلوب ہونے کے کیا معنی!

آپ غور فرمائیے کہ قرآن کریم نے، معبدِ انسانی کے اس سب سے بڑے بت کو کس طرح پاش پاش کر کے رکھ دیا۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ حضورؐ نے ایسا نظام قائم فرمایا جس سے عزو شرفِ انسانیت اپنے انتہائی عروج پر پہنچ گئی۔ اس میں۔ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز۔ اس میں ؎

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے — اس کی درگاہ میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

اس کے بعد کیا ہوا، اس حدیثِ الم انگیز کے پیش کرنے کا یہ مقام نہیں۔ (اس کے لئے دیکھئے میری کتاب "شاہکارِ رسالتؐ" کا آخری باب) اس وقت میں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ جو نظام حضورؐ کے مقدس ہاتھوں قائم ہوا تھا، اس میں، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، نہ کسی کے پاس فالتو درہم ہوتا تھا نہ دینار اور جو اسلام اب، اسلاف کے مسلک کی تائید کے سہارے پیش کیا جاتا ہے، اس کے متعلق دھڑلے سے کہا جاتا ہے کہ:

سرمایہ دارانہ اسلام اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرضیکہ کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ..... جس طرح اسلام ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو ..... نیز وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے۔ اور یہ کہ اُجرت یا شرکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوقِ ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔

(مسئلہ ملکیتِ زمین۔ از ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔ پہلا ایڈیشن۔ صفحہ ۵۲)

اس قسم کے سرمایہ دارانہ نظام میں انسانی آزادی کی جو مٹی پلید ہو سکتی ہے، وہ ظاہر ہے۔

لونڈیاں حضورؐ نے جنگ میں قید ہو کر آنے والی لڑکی کے سر کو خود اپنی ردائے مبارک سے ڈھانپا تھا۔ مذہبی پیشوائیت کے نظام کا فتویٰ یہ ہے کہ جنگ میں قید ہو کر آنے والی عورتوں کو لونڈیاں بنا کر سپاہیوں میں تقسیم کیا جائے گا تاکہ وہ انہیں اپنے استعمال میں لائیں۔ نہ ان لونڈیوں کی تعداد پر کوئی پابندی ہوگی، نہ ان سے نکاح کی ضرورت۔ یہ

سپاہی جب جی چاہے انہیں اپنے دوستوں کو تحفۃً بھی دے سکیں گے اور بازار میں فروخت بھی کر سکیں گے......
(تفہیم القرآن - مودودی صاحب - جلد اول صفحہ ۳۴۰ و تفہیمات - حصہ دوم - صفحہ ۳۰۷ الآخرہ)

یہ ہے وہ نظام جسے ہماری مذہبی پیشوائیت یہاں نافذ کرنا چاہتی ہے۔ جب (خدانکردہ) یہ نظام نافذ ہو جائے گا تو پھر کیا ہوگا، یہ بھی انہی کی زبانی سنیئے۔ مودودی صاحب اس باب میں فرماتے ہیں :-

قتلِ عام

جس علاقے میں اسلامی انقلاب ہوتا ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دیدیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخِ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظامِ اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانینِ اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجباتِ دین کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا اور پھر جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ (مرتد کی سزا، اسلامی قانون میں"۔ ۱۹۵۳ء ایڈیشن - صفحہ ۷۶)

ظاہر ہے کہ اسلام سے مراد وہی اسلام ہوگا جس کا سرٹیفکیٹ یہ حضرات عطا کر دیں گے! یہ اس دین کی اقامت کے مدعیوں کا اسلام ہے جس نے یہ کہہ کر فضائے انسانیہ میں مذہبی آزادی کا علم بلند کیا تھا کہ: قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ۔ (۱۸/۲۹) "اے رسول! ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آگیا ہے اب جس کا جی چاہے اسے قبول کرلے۔ جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے"۔ بہرحال یہ ہے جو مذہبی پیشوائیت کے دورِ اقتدار میں یہاں ہوگا۔

لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔ مذہبی پیشوائیت کی ساری تاریخ، اسی قسم کی خونریزیوں کی خونچکاں داستانوں سے لالہ زار ہے۔ چنگیز اور ہلاکو کی ہلاکت انگیزیوں کے قصے ان کے سامنے ہیچ ہیں۔

ہمیں اس سے غرض نہیں کہ یہ حضرات کس قسم کا نظام یہاں نافذ کرنے کے ارادے رکھتے ہیں۔ لیکن جب یہ اس نظام کو منسوب کرتے ہیں اس ذاتِ اقدس و اعظم کی طرف جو عالمگیر انسانیت کیلئے حریت اور آزادی کا پیغام لے کر آیا اور فضائے انسانی پر رحمۃ للعالمینی کا سحابِ کرم بن کر چھا یا تھا، تو ہمارا کلیجہ چھلنی ہو جاتا اور دل کا خون دردو الم کے آنسو بن کر آنکھ سے ٹپک پڑتا ہے۔

لیکن اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ زمانے کے تقاضے از خود مذہبی پیشوائیت کی زنجیروں کو توڑتے چلے جا رہے ہیں۔ جب یہ دیگر مذاہب میں نہیں رہیں تو مسلمانوں میں کس طرح رہ سکیں گی۔ باطل کے لئے تو مٹنا مقدر ہے۔ مسلکِ پیشوائیت مٹے گا اور دنیا اس نظام کی طرف آئے گی جس نے انسانی آزادی کا منشور عطا کیا تھا۔ وہ نظام جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ :-

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے | نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف | منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب | پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

ہزار ہزار سلام و صلوٰۃ ہو نوعِ انسان کے اس محسنِ اعظم پر جس نے دنیا کو اس آزادی سے ہمکنار کیا۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔

باسمہ تعالیٰ

علماء اور مشائخ، خدا کی طرف جانے والے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ (سورۂ توبہ۔ آیت ۳۴)

اسلامی قوانین کے راستے میں کون حائل ہے؟

(علماء کے باہمی شدید اختلافات)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی قوانین کے راستے میں کون حائل ہے؟

(۱) پاکستان کا خطۂ زمین اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی مملکت قائم کی جائے۔

(۲) اسلامی مملکت کی اوّلیں شرط یہ ہے کہ اس میں اسلامی قوانین نافذ ہوں ـــــ یہ حقائق ایسے ہیں، جنہیں یہاں مسلّمات کی حیثیت سے مانا جاتا ہے۔ اور ماننے جانا چاہیئے۔

لیکن اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں پھر اسلامی قوانین نافذ کیوں نہیں ہوتے؟ اگر اس کا جواب یہ دیا جائے کہ جب اسلامی قوانین مرتب ہی نہیں ہوئے تو وہ نافذ کس طرح ہوں! تو پھر، بصد حیرت، یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اسلامی قوانین مرتب کرنے میں کونسا امر مانع ہے۔ انہیں کیوں مرتب نہیں کیا جاتا؟

ہمارے علماء حضرات کی طرف سے اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ان قوانین کا مرتب کرنا حکومت کا کام ہے۔ چونکہ اربابِ حکومت (جو تشکیلِ پاکستان کے وقت سے لے کر آجتک برسرِ اقتدار رہے ہیں)۔ انہیں نافذ نہیں کرنا چاہتے اس لئے وہ انہیں مرتب ہی نہیں کرتے۔

چونکہ اس جواب سے، ہر حکومت کے خلاف پراپیگنڈہ کرنے، اور نفرت پھیلانے کا جواز (یا بالفاظِ صحیح بہانہ) میسر آجاتا ہے اس لئے اس خیال کو اس شدت اور تسلسل سے عام کیا گیا ہے کہ اب اسے ایک مسلّمہ کے طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے اور کوئی شخص اس پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا۔

ہم نہ پہلے کسی حکومت کے وکیل یا طرفدار رہے ہیں، نہ اب ہمیں کسی حکومت کی وکالت مقصود ہے لیکن اس امر کا واضح کرنا ہم اپنا فریضہ سمجھتے ہیں کہ یہ جواب حقیقت کے خلاف ہے اور یکسر مغالطہ آفرینی پر مبنی۔ اربابِ حکومت، اسلامی قوانین نافذ کرنا چاہتے ہوں یا نہ، ان قوانین کے مرتب نہ ہو سکنے کی ساری ذمہ داری خود ہمارے علماء کرام پر ہے۔ یہی اس کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہیں۔

ہمارے اس "الزام" کی علماء حضرات کی طرف سے تردید، اور ہماری مخالفت، تو فطری امر ہے لیکن ہمیں اس کا احساس ہے کہ عام دانشور طبقہ بھی (باستثنائے چند) اسے آسانی سے باور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ انہوں نے کبھی اس سوال کو اپنی اُس توجہ کے قابل ہی نہیں سمجھا جس توجہ اور غور و فکر کا

یہ مستحق ہے۔ ان کا عام ردِعمل یہ ہوتا ہے کہ "یہ مذہبی مسئلہ ہے جس کا ہم سے تعلق نہیں۔ طلوعِ اسلام ایک (CONTROVERSIAL FIGURE) ہے۔ ہم اس قسم کے تنازعہ فیہ مسائل میں سر کیوں کھپائیں۔ وہ جانے اور علماء حضرات جانیں۔ ہم سے اس کا تعلق نہیں"۔

ہم اس مسئلہ پر تیس سال سے برابر لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ اس سے ہمارا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ہم اپنے دانشور طبقہ پر اس حقیقت کو واضح کریں کہ یہ مسئلہ ایسا نہیں جس سے آپ کا کچھ تعلق نہیں۔ اس سے آپ کا تعلق ہے۔ آپ کے اور آپ کی آنی والی نسلوں کے مستقبل کا تعلق ہے۔ مملکتِ پاکستان کے استحکام کا تعلق ہے۔ خود نفسِ اسلام کا تعلق ہے۔ اس لئے آپ کا اس سے اس طرح لاتعلق ہو کر بیٹھ جانا، ناقابلِ تلافی نقصان کا موجب ہوگا۔ (جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی کہا ہے) ہم اس مسئلہ کے متعلق گذشتہ تیس سال سے برابر لکھتے چلے آ رہے ہیں لیکن سالِ گذشتہ اس نے خاص طور پر اہمیت اختیار کر لی تو ہم نے اس کے متعلق بار بار لکھا۔ بامرار و تکرار لکھا۔ طلوعِ اسلام میں مقالات لکھے۔ ہزارہا کی تعداد میں پمفلٹ شائع کئے۔ اور اب جب حکومت نے یہ فریضہ عدلیہ پر عائد کیا ہے کہ وہ تمام ایسے قوانین کو کالعدم قرار دے دے جو قرآن و سنت کے منافی ہوں، تو ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ ایک ایسا جامع مقالہ شائع کیا جائے جو اس موضوع کے تمام گوشوں کو محیط ہو۔ اس کی بنیاد ہمارا ایک مقالہ ہے جو ۱۹۶۰ء میں "کتاب و سنت" کے بارے میں علماء کرام کے باہمی اختلافات کے عنوان سے شائع کیا گیا تھا ——— ہمیں امید واثق ہے کہ اس مقالہ کا پوری توجہ سے مطالعہ کیا جائے گا ——— بالخصوص اس لئے کہ اب یہ علماء کرام اور طلوعِ اسلام کے مابین نزاعی مسئلہ نہیں رہا۔ اس کا تعلق عدلیہ سے ہو گیا ہے، اگرچہ ان سے سردست یہ کہا گیا ہے کہ قرآن و سنت کے منافی قوانین کو کالعدم قرار دیا جائے لیکن ظاہر ہے کہ اس کے بعد ان قوانین کی جگہ۔ یا دیگر قوانین بھی مرتب کئے جائیں گے۔ اس لئے اس سوال نے خصوصی اہمیت حاصل کر لی ہے۔

ہمارے ہاں اسلامی قوانین کو دو شقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (۱) شخصی قوانین (PERSONAL LAWS) اور (۲) ملکی قوانین (PUBLIC LAWS) یہ تقسیم یکسر غیر اسلامی ہے لیکن اس نقطہ کو ہم سردست نہیں چھیڑتے۔ شخصی قوانین ہر فرقے کے الگ الگ ہیں۔ امت میں فرقوں کا وجود بھی غیر اسلامی ہے۔ اور ہر فرقہ کے الگ الگ "اسلامی قوانین" بالکل غیر اسلامی تصور۔ اسلام کے مختلف اسلامی قوانین کا تو تصور ہی ناقابلِ فہم ہے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ چیز موجود ہے اس لئے اس کا ذکر ناگزیر ہے۔ ہم سردست مختلف فرقوں کے متعلق بھی بات نہیں چھیڑنا چاہتے۔ جہاں تک ان فرقوں کے مختلف "اسلامی قوانین" کا تعلق ہے، ان میں سے ہر فرقہ کا دعویٰ ہے کہ ان کا ضابطہ قوانین "قرآن و سنت" کے مطابق ہے۔

مختلف اور باہمد گر متضاد قوانین، اور ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ کہ وہ قرآن و سنت کے مطابق ہے، جس قدر تعجب انگیز اور حیرت افزا ہو سکتا ہے، ظاہر ہے۔ "قرآن و سنت" میں سے قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۔ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (۴/۸۲)۔ "کیا یہ لوگ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے! اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف

قرآن میں کوئی اختلافی بات نہیں

سے ہوتا تو یہ اس میں بہت سے اختلافات پاتے"۔ یعنی قرآنِ کریم اپنے من جانب اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ دیتا ہے، کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ قرآن کے اس دعویٰ کے بعد یہ تسلیم کرنا کہ یہ مختلف فرقوں کو ایسے قوانین دیتا ہے جو ایک دوسرے کے خلاف اور باہمدگر متضاد ہیں، قرآن کے من جانب اللہ ہونے سے انکار کے مرادف ہے اور کھلا ہوا کفر۔ قرآن کو من جانب اللہ ماننے والا اس کا تصور تک نہیں کر سکتا کہ مختلف فرقوں میں سے ہر فرقہ کے قوانین کو قرآن کی تائید اور موافقت حاصل ہو سکتی ہے۔ لہٰذا، ان قوانین کے اختلاف کی بنیاد قرآن نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد، اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کوئی شبہ ہی نہیں رہ جاتا کہ ان کے اختلاف کی بنیاد "سنت" ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف ہر فرقہ کو ہے کیونکہ ہر فرقہ کی "سنت" اپنی اپنی ہے اور وہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

شخصی قوانین کی حد تک تو یہ اختلافی صورت نبھ گئی، لیکن جب سوال پبلک لاز کا آیا تو مشکل پیدا ہو گئی۔ پبلک لاز ایسے نہیں ہوتے کہ ہر فرقہ کے لئے الگ الگ ہوں۔ ان کا اطلاق مملکت کے تمام باشندوں پر یکساں ہوتا ہے۔ قرآن، تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ اس لئے اگر شرط اتنی ہوتی کہ اسلامی قوانین کا قرآن کے مطابق ہونا لازمی ہے، تو پبلک لاز کا ایسا ضابطہ نہایت آسانی سے مرتب ہو جاتا جسے تمام مسلمان متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیتے۔ لیکن جب اس کے ساتھ یہ شرط بھی عائد کر دی جائے کہ ان قوانین کا سنت کے مطابق ہونا بھی ضروری ہے، تو اس سے "کھدا رد مریز" کی شکل پیدا ہو گئی۔ سنت ہر فرقہ کی الگ الگ ہے اس لئے سنت کی رو سے ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کس طرح ہو سکتا ہے جسے سب فرقے اسلامی تسلیم کر لیں!

یہ ہے اصل دشواری۔ آپ سوچئے کہ کوئی حکومت قرآن و سنت کی بنیاد پر ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کس طرح کر سکتی تھی۔ (اور کر سکتی ہے) جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں! اگر ایک قانون ایک فرقہ کے نزدیک مطابقِ سنت قرار پائے گا تو دوسرا فرقہ اسے خلافِ سنت قرار دے کر مسترد کر دے گا!

طلوعِ اسلام نے شروع ہی میں اس دشواری کو پیش کر دیا اور علماء حضرات سے کہا کہ:-

(۱) آپ سر جوڑ کر بیٹھیں اور ایک ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کر دیں جو آپ سب کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی ہو۔ (صدر ایوب مرحوم نے اس کی پیشکش بھی کی تھی لیکن انہیں اس کا جواب کا نوں میں ملا تھا)۔

(۲) اگر آپ خود ایسا نہیں کرنا چاہتے تو "سنت" کا کوئی ایسا مجموعہ مرتب کر کے حکومت کو دے دیں جو آپ سب کے نزدیک متفقہ طور پر قابلِ تسلیم ہو۔

(۳) اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ناممکن ہے تو پھر "قرآن و سنت" کی شرط سے، سنت کو حذف کر دیں اور یہ مطالبہ کریں کہ حکومت ایسا ضابطۂ قوانین مرتب اور نافذ کر دے جو قرآن کے خلاف نہ ہو۔

علماء حضرات ان میں سے کسی بات پر بھی آمادہ نہ ہوئے، اور اس بات کو چھپانے کے لئے کہ ملک کا اہلِ علم و دانش طبقہ ان کے اس طرزِ عمل کو غیر معقول (UN-REASONABLE) قرار نہ دے یہ مشہور کر دیا کہ طلوعِ اسلام منکرِ حدیث ہے منکرِ شانِ رسالت ہے۔ ملحد ہے۔ بے دین ہے۔ اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ اور اس کا پروپیگنڈہ اس شدت سے کیا کہ اصل حقیقت لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی اور ہر ایک کے سامنے تصور یہی رہ گیا کہ طلوعِ اسلام منکرِ حدیث ہے، منکرِ شانِ رسالت ہے۔ یہی ان حضرات کا مقصد تھا۔

لیکن طلوعِ اسلام نے ان کی اس تمام مخالفت کو نہایت استقامت اور تحمل سے برداشت کیا اور اپنی پکار کو برابر دہرائے جاتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مودودی صاحب جیسے داعیٔ اقامتِ دین کو بالآخر اقرار اور اعلان کرنا پڑا کہ:

کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو پبلک لاء کے معاملہ میں حنفیوں، شیعیوں اور اہلحدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔ (ایشیا - ۲۳ر اگست ۱۹۷۰ء)

آپ سوچتے ہوں گے کہ اس کے بعد انہوں نے کہہ دیا ہوگا کہ پبلک لاء کا ایسا ضابطہ مرتب کر دیا جائے جو قرآن کے مطابق ہو۔ لیکن آپ بھولتے ہیں۔ وہ اگر ایسا کہہ دیتے تو سارا کھیل ہی ختم ہو جاتا۔ انہوں نے اس کا بھی اعتراف کیا اور اس کے ساتھ یہ مطالبہ بھی جاری رکھا کہ حکومت، قرآن و سنت کے مطابق پبلک لاء کا ضابطہ مرتب کرے!

ہمیں مودودی صاحب پر کچھ تعجب نہیں۔ تعجب، اس بات پر ہے کہ ملک میں کسی نے ان سے اتنا نہیں پوچھا کہ جس چیز کو آپ خود ناممکن العمل قرار دیتے ہیں، دوسروں سے اس کا مطالبہ کس طرح کرتے ہیں؟ کسی نے ان سے اتنا نہیں پوچھا، اور وہ برستور اس مطالبہ کو دہرائے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اب، جب حکومت نے عدلیہ سے کہا ہے کہ وہ.... "قرآن و سنت" کے خلاف قوانین کو کالعدم قرار دے، تو مودودی صاحب نے اس اعلان کا پُرجوش استقبال کیا ہے۔ وہ خوش ہیں کہ یہ بلا ان کے (یا مذہبی پیشوائیت کے) سر سے ٹل گئی۔ اب لوگوں کی مخالفت کا ہدف، عدلیہ قرار پائے گی۔

یہ ہیں وہ حالات جن کے پیشِ نظر ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ایک بار پھر (جامع طور پر) واضح کر دیں کہ حدیث یا سنت کے معاملہ میں علماء حضرات کے باہمی اختلافات کس قدر گہرے اور شدید ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آ جائے گی کہ پاکستان میں جو اسلامی قوانین مرتب نہیں ہو پاتے تو اس کے ذمہ دار خود یہ علماء ہیں۔

سنت کی بحث

یہ بتایا جا چکا ہے کہ (پاکستان میں تو ایک طرف) تمام عالمِ اسلام میں، کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں درج شدہ "سنتِ رسولؐ" کو تمام فرقے متفقہ طور پر سنتِ رسولؐ تسلیم کرتے ہوں۔ ایسی کتاب کی عدم موجودگی تو ایک طرف، آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ آج تک "سنت" کی کوئی متفق علیہ تعریف (DEFINITION) بھی متعین نہیں ہو سکی۔ سنی مسلمانوں میں اکثریت اہلِ فقہ کی ہے۔ وہ حدیث یا سنت سے الگ بحث ہی نہیں کرتے۔ ان کے عقیدہ کی رو سے (ان کی) فقہ میں یہ سب کچھ آ گیا ہے۔ اہلِ حدیث حضرات، حدیث ہی کو سنت قرار دیتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک احادیث کے مطابق (یعنی ان احادیث کے مطابق جنہیں وہ صحیح تسلیم کرتے ہیں)، عمل کرنا ہی اتباعِ سنت ہے۔ لیکن مودودی صاحب اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا۔ (اُس زمانے کے) جمعیت اہلِ حدیث کے صدر، مولانا محمد اسماعیل (مرحوم) نے ایک کتابچہ شائع فرمایا تھا جس کا عنوان تھا: "جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث" اس میں انہوں نے مودودی صاحب کے نظریۂ حدیث و سنت پر کڑی تنقید کی تھی۔ (جیسا کہ کہا جا چکا

ہے) ان کے نزدیک، حدیث اور سنت ایک ہی چیز ہے۔ لیکن مودودی صاحب کا مسلک یہ ہے کہ :-

مودودی صاحب کے نزدیک

سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالٰی نے اپنے نبیؐ کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بہ حیثیت ایک انسان ہونے کے۔ یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کئے تھے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق و امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کونسا جزو سنت ہے اور کونسا جزو عادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔ . . . . تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبی صلعم تشریف لائے تھے اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی صلعم نے ان اصولوں کی پیروی کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضورؐ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں۔ کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپ پیدا ہوئے تھے، اور کچھ اس زمانے کے حالات پر جن میں آپ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سنت بنا دینا مقصود نہ تھا۔

(رسائل و مسائل۔ حصہ اول۔ ص۲۱۳ ؛ ص۲۱۴)

اسی کتاب میں وہ ص۲۱۲ پر لکھتے ہیں :-

بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضورؐ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرزِ معاشرت اور آپ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو سنت بنانا نہ تو مقصود تھا نہ اس کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رو سے اس طرزِ خاص کا لباس نبیؐ پہنتے تھے اور نہ شرائع الٰہیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سنت بنا دیں۔ سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاح شرعی میں سنت نہیں ہیں ان کو خواہ مخواہ سنت قرار دے لینا منجملہ ان بدعات

۱؎ دوسرے مقام پر مودودی صاحب یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ :-

جس وقت اللہ تعالٰی نے آپؐ کو منصبِ رسالت سے سرفراز کیا اس وقت سے لے کر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپؐ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسولؐ تھے۔ آپؐ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔ اسی حیثیت میں آپؐ مبلغ اور معلم بھی تھے۔ مربی اور مزکی بھی تھے۔ قاضی اور حاکم بھی تھے امام اور امیر بھی تھے حتٰی کہ آپؐ کی نجی اور شہری زندگی کے سارے حالات بھی اسی حیثیت کے تحت آ گئے تھے۔ (تفہیمات حصہ اول ص۲۴۲)

اور رسائل و مسائل میں آپ حضورؐ کی شخصی زندگی اور رسالت کو الگ الگ قرار دے رہے ہیں۔ یقیناً آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ ایسے اہم مسئلہ میں اس قدر تضاد کیوں ؟ لیکن اس میں حیرت اور تعجب کی کوئی بات نہیں۔ مودودی صاحب کے ہاں اس قسم کے تضادات عام ملیں گے۔

کے ہے جن سے نظامِ دینی میں تحریف واقع ہوتی ہے۔

یعنی اہلِ حدیث حضرات کے نزدیک صحیح حدیث میں جو کچھ آیا ہے وہ سب کا سب سنتِ رسول اللہؐ کے دائرے میں شامل ہے اور اس سے انکار کرنا کفر ہے۔ لیکن مودودی صاحب کے نزدیک صحیح احادیث میں سے وہ باتیں سنت کے دائرے میں داخل نہیں جنہیں نبی اکرمؐ نے اپنی بشری حیثیت سے عادتاً اختیار کیا تھا۔ اگر کوئی شخص ان باتوں کو بھی سنت قرار دے تو اس کے متعلق مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ:۔

> میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریفِ دین ہے جس سے نہایت برے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۳)

اس سے ذرا پہلے لکھتے ہیں:۔

> جو امور آپؐ نے عادتاً کیے ہیں انہیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں، اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے۔
>
> (ایضاً۔ صفحہ ۳)

اِس کا نتیجہ

ان تصریحات کی روشنی میں، ایک عملی شکل کو سامنے لائیے کہ آئینِ پاکستان میں یہ شق رکھ دی جاتی ہے کہ یہاں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوگا جو "کتاب و سنت" کے خلاف ہو۔ ملک میں ایک قانون نافذ ہو جاتا ہے۔ اہلِ حدیث حضرات چیلنج کرتے ہیں کہ وہ "سنت" کے خلاف ہے اس لئے ناجائز ہے۔ اس کی تائید میں وہ ایک حدیث پیش کر دیتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں مودودی صاحب تشریف لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ، وہ قانون سنت کے خلاف نہیں۔ اہلِ حدیث حضرات دریافت کرتے ہیں کہ انہوں نے جو حدیث پیش کی ہے وہ صحیح ہے یا نہیں؟ مودودی صاحب جواب دیتے ہیں کہ وہ حدیث تو صحیح ہے لیکن رسول اللہؐ نے وہ عمل، اپنی بشری حیثیت سے عادتاً فرمایا تھا رسول ہونے کی حیثیت سے نہیں کیا تھا۔ اہلِ حدیث حضرات پوچھتے ہیں کہ حدیث کی کسی کتاب میں تو یہ لکھا نہیں کہ حضورؐ نے فلاں کام بحیثیت رسولؐ کیا تھا یا بشری حیثیت سے۔ تو پھر اس کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے کہ حضورؐ نے وہ کام عادتاً کیا تھا۔ مودودی صاحب اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ایسے معاملات کا فیصلہ سند اور دلیل کی رُو سے نہیں ہوا کرتا۔ اس کا فیصلہ وہی شخص کر سکتا ہے۔

> جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کرکے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو۔ کثرتِ مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہؐ کا مزاج شناس ہو جاتا ہے . . . . اس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے . . . . . . اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد وہ اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت کو دیکھ لیتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس جامِ زریں میں

جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاج نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی۔ ط

تفہیمات۔ حصہ اوّل۔ ص۳۰۲ ز ص۳۲۳)

مولانا اسمٰعیل (مرحوم) نے اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا۔

اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسول کا مزاج شناس تصور کر لے۔ پھر اسے اختیار دے دے کہ اصولِ محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کر لے۔ جسے چاہے رد کر دے۔ یا کوئی عالم یا قائد بلاوجہ کسی موضوع یا معلق، مرسل یا منقطع حدیث کے متعلق یہ دعوے کر دے کہ ہیں نے اس ہیں "ہیرے کی جوت" دیکھ لی ہے۔ تو یہ مضحکہ انگیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم انشاءاللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنتِ رسولؐ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔

(جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث ص۶۳)

یعنی جس چیز کو مودودی صاحب سنتِ رسول اللہؐ قرار دیتے ہیں اسے مولانا محمد اسماعیل (مرحوم) سنت کے خلاف ہوائی حملے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور سنت کو ایسے حملوں سے محفوظ رکھنے کو اپنا فریضہ قرار دیتے ہیں۔

اصلاحی صاحب

یہاں تک بات صرف مودودی صاحب اور مولانا اسمٰعیل (مرحوم) کے درمیان تھی۔ اس کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی صاحب تشریف لاتے ہیں۔ (جو اس زمانے میں مودودی صاحب کے دستِ راست تھے)۔ ان کا ارشاد ہے کہ:-

حدیث تو ہر وہ قول یا فعل یا تقریر ہے جس کی روایت نبی صلعم کی نسبت کے ساتھ کی جاتی ہے۔ لیکن سنت سے مراد نبی صلعم کا صرف ثابت شدہ اور معلوم طریقہ ہے جس پر آپؐ نے بار بار عمل کیا ہو۔ جس کی آپؐ نے محافظت فرمائی ہو۔ جس کے حضورؐ عام طور پر پابند رہے ہوں۔ (ایضاً۔ ص۲۵)

اس کے متعلق مولانا اسمٰعیل (مرحوم) نے لکھا تھا۔

مولانا (اصلاحی) نے سنت کی تعریف کو اس قدر سکیڑ دیا ہے کہ اس کا تعلق صرف چند اعمال سے ہی ہوگا، جن کا ثبوت آنحضرتؐ سے علیٰ سبیل الاستمرار ہے جیسے نماز کے بعض ارکان ۔۔۔۔۔ ہزار دفعہ فرمایا جاتا ہے کہ " اگر کوئی شخص اس سنت کو ماخذِ دین تسلیم نہیں کرتا تو میں اسے مسلمان تسلیم نہیں کرتا" سوال یہ ہے کہ اس سنت کی پہنائی ہے کہاں تک ـــــــــ اس کا احاطہ چند اعمال سے آگے نہیں بڑھے گا۔ پورا اسلام تو کسی دوسری جگہ سے ہی ثابت کرنا ہوگا۔ پھر اس ادعا کی ضرورت ہی کیا ہے"۔ (ایضاً۔ ص۲۱)

یہ ہے "سنت" کی تعریف (DEFINITION) کے متعلق ان حضرات کا وہ اختلاف جس کی بنا پر مولانا اسمٰعیل (مرحوم) نے فرمایا تھا کہ:-

میری رائے میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے نظریات نہ صرف مسلکِ اہلِ حدیث کے خلاف ہیں بلکہ یہ نظریات تمام ائمہ اہلِ حدیث کے خلاف ہیں۔ ان میں آج کے جدید اعتزال و تجہم کے جراثیم مخفی ہیں۔ (ایضاً۔ ص۱۱)

ط نگاہِ بصیرت کے اختلاف کے متعلق مودودی صاحب کا ایک قول ذرا آگے جا کر سامنے آئے گا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ "کتاب و سنت" کا مطالبہ کرنے والوں میں اس امر پر بھی اتفاق نہیں کہ "سنت" کہتے کسے ہیں؟ جو چیز ایک کے نزدیک "سنت" ہے۔ وہ دوسرے کے نزدیک "بدعت اور دین میں تحریف" ہے۔

حدیث

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ صحیح احادیث کی موجودگی میں بھی یہ ممکن نہیں کہ یہ حضرات "سنت" کا کوئی متفق علیہ مجموعہ پیش کر سکیں۔ لیکن اس سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ ان حضرات کے پاس احادیث کا کوئی ایسا مجموعہ ہے جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ قطعاً نہیں۔ احادیث کے بے شمار مجموعے ہیں۔ مولانا سندھی (مرحوم) کے الفاظ میں:-

میں نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۰۵۲ھ) کے مقدمہ مشکوٰۃ میں جب یہ مضمون دیکھا کہ پچاس کے قریب حدیث کی کتابیں ہیں جن میں صحیح اور غیر صحیح احادیث جمع کی گئی ہیں اور شیخ صاحب نے ان سب کو ایک درجہ پر رکھا ہے۔ وہ صحاح ستہ میں بھی غلط روایات کا اختلاط اسی طرح مانتے ہیں جس طرح باقی کتب میں۔ تو میرے دماغ پر ایک پریشانی طاری ہوگئی۔ (مقامِ حدیث۔ جلد اول۔ پہلا ایڈیشن۔ صفحہ ۲۴۹)

یعنی (شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تحقیق کے مطابق) احادیث کے قریب پچاس مجموعے ہیں اور سب میں غلط اور صحیح احادیث ملی جلی ہیں۔ ان میں چھ کتابوں کو "صحاح ستہ" (یعنی صحیح کتابیں) کہا جاتا ہے[1]۔ ان میں بھی اختلاف ہے کہ یہ چھ کون کونسی ہیں۔ لیکن ان میں سے بخاری اور مسلم کو سب سے اونچا درجہ دیا جاتا ہے۔ پھر ان دونوں میں بخاری کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیا جاتا ہے۔

"حدیث" کے متعلق مولانا اسماعیل (مرحوم) فرماتے ہیں:-

قرآن اور حدیث کی ایک حیثیت ہے

تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآنِ عزیز کا ہے اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان و دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآنِ عزیز کے انکار کا ..... جو احادیث قواعد صحیحہ اور اثرِ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں۔ ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مرادف۔

(جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث۔ صفحہ ۴۸)

بخاری اور مسلم کے مجموعوں کے متعلق آپ ارشاد فرماتے ہیں:-

بخاری اور مسلم کی احادیث کی صحت پر اُمت متفق ہے ..... ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔

(ایضاً۔ صفحہ ۵۵)

بالفاظِ دیگر، مولانا اسمٰعیل (مرحوم) کے نزدیک، بخاری اور مسلم کی کسی حدیث کے انکار کا وہی اثر ہے جو قرآنِ عزیز کے انکار کا ہے۔ ان احادیث کا انکار کفر ہے اور ایسا کرنے والا مسلمانوں کے گروہ سے خارج ہو جاتا ہے۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:-

---

[1] یہ سُنیوں کے مجموعے ہیں۔ شیعہ حضرات کے احادیث کے اپنے مجموعے ہیں۔

جبرائیل قرآن اور سنت دونوں کو لے کر نازل ہوتے تھے۔ آنحضرتؐ کو سنت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے۔ اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔ (ایضاً۔ صفحہ)

یعنی اہل حدیث حضرات کے عقیدہ کی رو سے قرآن اور حدیث دونوں خدا کی طرف سے بذریعہ وحی حضورؐ کو ملے تھے۔ اور دونوں کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں۔ اب دیکھئے اس باب میں مودودی صاحب کیا فرماتے ہیں:۔

مودودی صاحب کا مسلک

قرآن کے کلام اور محمد صلعم کے اپنے کلام میں زبان اور اسلوب کا اتنا نمایاں فرق ہے کہ کسی ایک انسان کے دو اس قدر مختلف اسٹائل کبھی نہیں ہو سکتے۔ یہ فرق صرف اسی زمانہ میں واضح نہیں تھا جبکہ نبی صلعم اپنے ملک کے لوگوں میں رہتے سہتے تھے بلکہ آج بھی حدیث کی کتابوں میں آپ کے سینکڑوں اقوال اور خطبے موجود ہیں۔ ان کی زبان اور اسلوب قرآن کی زبان اور اسلوب سے اس قدر مختلف ہیں کہ زبان و ادب کا کوئی رمز آشنا نقاد یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہو سکتے ہیں۔

(ترجمان القرآن۔ بابت ستمبر ۱۹۵۲ء)

اس سے مودودی صاحب نے واضح کر دیا کہ مولانا محمد اسمٰعیل (مرحوم) کا یہ ارشاد (کہ احادیث بھی قرآن کی طرح منزل من اللہ وحی ہیں) صحیح نہیں۔ قرآن، خدا کا کلام ہے اور احادیث، نبی اکرمؐ کا اپنا کلام۔ اور دونوں کا فرق بالکل بدیہی اور واضح ہے۔

دوسرے مقام پر مودودی صاحب لکھتے ہیں:۔

ان امور کے متعلق (یعنی دجال کے متعلق) جو مختلف باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں وہ دراصل آپؐ کے قیاسات ہیں جن کے بارے میں آپؐ خود شک میں تھے ..... یہ باتیں آپؐ نے علم وحی کی بنا پر نہیں فرمائی تھیں بلکہ اپنے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں اور آپؐ کا گمان وہ چیز نہیں جس کے صحیح نہ ثابت ہونے سے آپؐ کی نبوت پر کوئی حرف آتا ہو یا جس پر ایمان لانے کے لئے ہم مکلف کئے گئے ہوں۔

(رسائل و مسائل۔ حصہ اول۔ صفحہ ۵۶-۵۵)

اس کے بعد وہ اسی کتاب کے صفحہ ۶۷ پر لکھتے ہیں:۔

احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آئی ہیں جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ گمان صحت ہے نہ کہ علم یقین۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کو اس خطرے میں ڈالنا ہرگز پسند نہیں کر سکتا کہ جو امور اس کے دین میں اس قدر اہم ہوں کہ ان سے کفر و ایمان کا فرق واقع ہوتا ہو، انہیں صرف چند آدمیوں کی روایت پر منحصر کر دیا جائے۔ ایسے امور کی تو نوعیت ہی اس امر کی متقاضی ہے کہ اللہ تعالےٰ ان کو صاف صاف اپنی کتاب میں بیان فرمائے۔ اللہ کا رسولؐ انہیں اپنے پیغمبرانہ مشن کا اصل کام سمجھتے ہوئے ان کی تبلیغ عام کرے اور وہ بالکل غیر مشتبہ طریقے سے ہر ہر مسلمان تک پہنچا دیئے گئے ہوں۔

دوسرے مقام پر وہ احادیث کے متعلق اپنا عقیدہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

نبی صلعم کے قول و فعل کو میں بھی قرآن کی طرح حجت مانتا ہوں اور میرے نزدیک جو عقیدہ حضورؐ نے بیان کیا ہو

یا جو حکم آپؐ نے ارشاد فرمایا ہو وہ اسی طرح ایمان و اطاعت کا مستحق ہے جس طرح کوئی ایسا عقیدہ یا حکم جو قرآن میں آیا ہو۔ لیکن قولِ رسولؐ اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں لازماً ایک ہی چیز نہیں ہیں۔ اور نہ ان روایات کو استناد کے لحاظ سے آیاتِ قرآنی کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیاتِ قرآنی کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں۔ بخلاف اس کے، روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو نبی صلعم کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں۔

(رسائل و مسائل۔ حصہ اوّل۔ صفحہ ۲۷۰-۲۷۹)

آگے چل کر فرماتے ہیں:-

اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح و معتبر ہونا بجائے خود ایک بحث ہوتا ہے۔ آپ (فریقِ مقابل) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسولؐ مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۹)

یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ مودودی صاحب کے نزدیک، احادیث کے پرکھنے کی کسوٹی "مزاج شناسِ رسولؐ" کی نگہ بصیرت ہے۔ جس حدیث کو وہ صحیح کہہ دے، وہ صحیح ہو گی۔ جسے وہ غلط قرار دے دے وہ غلط قرار پا جائے گی۔ لیکن اس کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں کہ کسی کی "نگہ بصیرت" دوسرے کے لئے سند نہیں قرار پا سکتی۔ وہ فرماتے ہیں:-

اس باب میں اختلاف کی بھی کافی گنجائش ہے کیونکہ ایک شخص کا ذوق اور اس کی بصیرت لازماً دوسرے شخص کے ذوق اور بصیرت سے بالکل مطابق نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ بالحاظ دونوں کا ایک ہی ہو۔ لہٰذا کسی شخص کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ صرف وہی چیز شرعی ہے جس کو میری بصیرت شرعی کہہ رہی ہے اور دوسرے شخص کی بصیرت جس کو شرعی کہتی ہے وہ قطعاً و یقیناً غلط ہے۔ (تفہیمات۔ حصہ دوم۔ صفحہ ۳۳۱)

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک:-

(۱) جو عقیدہ نبی اکرمؐ نے بیان کیا ہو یا جو حکم حضورؐ نے دیا ہو اس پر ایمان لانا اور اس کی اطاعت کرنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح قرآن میں بیان کردہ عقیدہ یا حکم پر ایمان لانا اور اس کی اطاعت کرنا۔

(۲) جو کچھ نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا وہ احادیث کی کتابوں میں منقول ہے لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ وہ سب کا سب نبی اکرمؐ کا فرمودہ ہے۔ وہ صرف حضورؐ کی طرف منسوب ہے۔

(۳) اس کا فیصلہ کرنا نہایت ضروری ہے کہ جو کچھ رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس میں فی الواقعہ رسول اللہؐ کا فرمودہ کیا ہے اور وہ کون سی باتیں ہیں جنہیں حضورؐ کی طرف غلط منسوب کر دیا گیا ہے۔

(۴) اس چیز کا فیصلہ "مزاج شناسِ رسولؐ" کی نگہ بصیرت ہی کر سکتی ہے۔

(۵) لیکن نگہ بصیرت ہر شخص کی الگ الگ ہوتی ہے۔ اس لئے یہ ضروری نہیں کہ جس بات کو ایک شخص فرمودۂ رسولؐ قرار دے، اسے دوسرا شخص بھی بالضرور فرمودۂ رسولؐ تسلیم کرے۔

مودودی صاحب منکرِ حدیث ہیں

مودودی صاحب کے انہی خیالات کو پڑھ کر، مولانا ظفر احمد عثمانی (مرحوم۔سابق) صدر جمعیت علمائے اسلام پاکستان نے اپنے فتوے میں لکھا تھا کہ:۔

یہ شخص منکرِ حدیث ہے۔ گمراہ اور مبتدع ہے۔ جاہلِ اجہل ہے۔ پاگل ہے۔

(مقامِ حدیث۔ جلد دوم۔ پہلا ایڈیشن۔ صفحہ ۴۰۹-۱۱)

قطع نظر اس کے کہ مودودی صاحب کے متعلق اہلِ حدیث اور حنفی علماء کے خیالات کیا ہیں، غور طلب بات یہ ہے کہ حدیث کے متعلق جو نظریہ انھوں نے بیان فرمایا ہے اس کا عملی نتیجہ کیا ہوگا۔ اگر دین انفرادی چیز ہو تو ہو سکتا ہے کہ جس بات کو زید اپنی نگہ بصیرت کے مطابق فرمودۂ رسولؐ سمجھے وہ اس پر عمل کرے اور جسے بکر، اپنی بصیرت کے مطابق

عملی نتیجہ

فرمودۂ رسولؐ سمجھے وہ اس پر عمل پیرا ہو جائے دونوں کو ان کی "حسنِ نیت" کا ثواب مل جائے گا۔ لیکن جب آپ "فرمودۂ رسولؐ" کو مملکت کے آئین اور حکومت کے قوانین کی غیر متبدل اور ابدی بنیاد قرار دیدیں اور اس امر کا فیصلہ کر دیں کہ مملکت میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوگا جو "فرمودۂ رسولؐ" کے خلاف ہو اور _____ کسی بات کے "فرمودۂ رسولؐ" ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ افراد کے ذوق اور بصیرت کی رُو سے ہو تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ کیا اس طرح پاکستان یا کسی اور مملکت میں اسلامی قوانین کا کوئی ضابطہ بھی مدوّن ہو سکے گا؟

بخاری کی احادیث

مولانا اسماعیل (مرحوم) نے فرمایا تھا کہ صحیحین۔ یعنی بخاری اور مسلم کی سب احادیث صحیح ہیں اور ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔ مودودی صاحب اس باب میں فرماتے ہیں کہ:۔

یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔ (ترجمان القرآن۔ اکتوبر و نومبر ۱۹۵۲ء)

یہ خیال تنہا مودودی صاحب کا نہیں۔ پاکستان میں اکثریت حنفی مسلمانوں کی ہے۔ اسی فرقہ کے ایک مجتہد عالم، مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی، صدر مدرس جامعہ اشرفیہ ٹنڈو الہ یار (جن کا ذکر پہلے آچکا ہے اور جو اب مرحوم ہو چکے ہیں)۔ اپنے ایک مکتوبِ گرامی میں فرماتے ہیں:۔

حنفیہ کے نزدیک بھی کتاب البخاری و مسلم اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہیں۔ اور مسلم پر بخاری کو ترجیح ہے مگر اس سے وہ مواضع مستثنےٰ ہیں جن پر دار قطنی وغیرہ محدثین نے تنقید کی ہے کہ ان کی صحت پر اتفاق نہیں بلکہ محل اختلاف ہیں۔ دار قطنی وغیرہ نے تقریباً دو سو احادیث پر تنقید کی ہے جو بخاری و مسلم میں موجود ہیں۔ ان مواضع کے سوا بقیہ کی صحت پر اتفاق ہے۔

(طلوعِ اسلام۔ اگست ۵۹ء۔ صفحہ ۷۴)

بخاری و مسلم کی احادیث کے متعلق یہ عقیدہ حنفی علماء کا ہے۔ بخاری کی ایک حدیث پر تنقید کرتے ہوئے جماعتِ اہلحدیث کے سرخیل۔ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) ترجمان القرآن۔ جلد دوم۔ (صفحہ ۲۹۹-۵۰) میں لکھتے ہیں کہ:۔

روایات کی قسموں میں سے کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو، بہرحال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ نہیں اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کے لئے یقینیاتِ دینیہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ ہمیں مان لینا پڑے گا کہ یہ (بخاری کی روایت درباره کذب حضرت ابراہیمؑ) اللہ کے رسولؐ کا قول نہیں ہو سکتا۔ یقیناً یہاں راویوں سے غلطی ہوئی ہے اور ایسا ان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا اور نہ زمین شق ہو جائے گی۔

یعنی مولانا آزاد (مرحوم) کے نزدیک بخاری اور مسلم میں بھی ایسی روایات موجود ہیں جنہیں قولِ رسولؐ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس مقام پر مختصر طور پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ احادیث کے یہ مجموعے (مثلاً بخاری وغیرہ) مرتب کس

اَحادیث مرتب کیسے ہوئی تھیں؟

طرح ہوئے تھے؟ یہ واقعہ ہے جس سے کسی کو بھی مجالِ انکار نہیں کہ:-

۱۔ نبی اکرمؐ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب کرا کر اُمت کو نہیں دیا تھا۔

۲۔ نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے اس قسم کا کوئی مجموعہ مرتب کیا تھا۔ (انہوں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ تفصیل اس اجمال کی آگے چل کر آئے گی)۔

۳۔ رسول اللہؐ کی وفات کے قریب اڈھائی سو سال بعد امام محمد بن اسمٰعیل نے (جو بخارا کے رہنے والے تھے اور جنہوں نے ۲۵۶ھ میں وفات پائی) اپنے طور پر احادیث کو جمع کرنا شروع کیا۔ ان کے سامنے کوئی تحریری ریکارڈ نہیں تھا۔ انہوں نے ان روایات کو جمع کیا جو زبان زدِ خلائق تھیں اور جنہیں نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ مثلاً اس کا طریق یہ تھا کہ جس شخص نے امام بخاریؒ سے کوئی روایت بیان کی۔ اس نے کہا کہ میں نے یہ بات فلاں صاحب سے سنی تھی۔ انھوں نے فلاں سے سنی۔ انھوں نے فلاں سے۔ انھوں نے فلاں صحابی سے جنہوں نے کہا کہ رسول اللہؐ نے یوں ارشاد فرمایا تھا۔

امام بخاریؒ نے لکھا ہے کہ اس طرح انھوں نے قریب چھ لاکھ احادیث جمع کیں۔ ان میں سے انھوں نے ۷۲۷۵ احادیث کو اپنی شروط کے مطابق پایا۔ باقی کو مسترد کر دیا۔ ان میں سے اگر مکررات کو نکال دیا جائے تو باقی روایات کی تعداد ۲۷۶۲ رہ جاتی ہے۔ انہیں امام بخاریؒ کی احادیث کہا جاتا ہے۔ احادیث کے باقی مجموعے بھی اسی طرح مرتب ہوئے تھے۔

اس طریق سے جمع کردہ روایات میں غلطیاں کس انداز سے ہوتی ہیں، اس کے متعلق مودودی صاحب نے بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔ روایت میں سب سے پہلے بات یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ فلاں صحابیؓ نے کہا کہ رسول اللہؐ نے یوں ارشاد فرمایا تھا۔ اس ضمن میں مودودی صاحب، (بخاریؒ کی ایک حدیث پر تنقید کرتے ہوئے) لکھتے ہیں:-

مودودی صاحب کی تنقید

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو نبیؐ کے بیان کو سمجھنے میں حضرت ابوہریرہؓ سے کوئی غلطی ہوئی ہے یا وہ پوری بات سن نہیں سکے ہوں گے ..... اس قسم کی غلط فہمیوں کی مثالیں متعدد روایات میں ملتی ہیں جن میں سے بعض کو بعض روایات نے صاف کر دیا ہے۔ اور بعض صاف ہونے سے رہ گئیں۔ زبانی روایات میں

ایسا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ (تسنیم - احادیث نمبر - مورخہ ۱۴ مئی ۱۹۵۵ء)

یعنی مودودی صاحب کے نزدیک سلسلۂ روایات کی پہلی کڑی میں ہی غلط فہمیوں کی گنجائش تھی۔ اب رہیں بعد کی کڑیاں۔ سو اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:-

بادی النظر میں یہ بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ایسی فعلی اور قولی احادیث کو تواتر کا درجہ حاصل ہونا چاہیئے جن کے دیکھنے اور سننے والے بکثرت ہوں۔ ان میں اختلاف نہ پایا جانا چاہیئے۔ لیکن ہر شخص بادنیٰ تامل یہ سمجھ سکتا ہے کہ جس واقعہ کو بکثرت لوگوں نے دیکھا ہو، یا جس تقریر کو بکثرت لوگوں نے سنا ہو، اس کی نقل کرنے یا اس کے مطابق عمل کرنے میں سب لوگ اس پر متفق نہیں ہو سکتے کہ ان کے درمیان یک سرمو فرق نہ پایا جائے۔ اُس واقعہ یا اُس تقریر کے اہم اجزاء میں تو سب کے درمیان ضرور اتفاق ہوگا، مگر فرعی امور میں بہت کچھ اختلاف بھی پایا جائے گا اور یہ اختلاف ہرگز اس بات کی دلیل نہ ہوگا کہ وہ واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔ مثال کے طور پر آج میں ایک تقریر کرتا ہوں اور کئی ہزار آدمی اس کو سنتے ہیں۔ جلسہ ختم ہونے کے چند گھنٹے بعد ہی (مہینوں اور برسوں بعد نہیں بلکہ چند ہی گھنٹے بعد) لوگوں سے پوچھ لیجیئے کہ مقرر نے کیا کہا؟ آپ دیکھیں گے کہ تقریر کا مضمون نقل کرنے میں سب کا بیان یکساں نہ ہوگا۔ کوئی کسی ٹکڑے کو بیان کرے گا کوئی کسی ٹکڑے کو۔ کوئی کسی جملے کو لفظ بلفظ نقل کرے گا۔ کوئی اس مفہوم کو جو اس کی سمجھ میں آیا ہے اپنے الفاظ میں بیان کر دے گا۔ کوئی زیادہ فہیم آدمی ہوگا اور تقریر کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اس کا صحیح ملخص بیان کرے گا۔ کسی کی سمجھ زیادہ اچھی نہ ہوگی اور وہ مطلب کو اپنے الفاظ میں اچھی طرح نہ ادا کر سکے گا۔ کسی کا حافظہ اچھا ہوگا اور وہ تقریر کے اکثر حصے لفظ بلفظ نقل کر دے گا۔ کسی کی یاد اچھی نہ ہوگی وہ نقل و روایت میں غلطیاں کرے گا۔

(تفہیمات - حصہ اوّل - صفحہ ۳۲۹-۳۰)

یہ تھا وہ طریق جس کے مطابق احادیث کے مجموعے مرتب ہوئے۔ آپ خیال فرمایئے کہ اس انداز سے مرتب شدہ احادیث میں سے کسی حدیث کے متعلق بھی حتمی اور یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ من وعن رسول اللہ کا قول ہے؟ یہ بھی واضح رہے کہ احادیث کے متعلق یہ کسی کا بھی عقیدہ نہیں کہ وہ رسول اللہؐ کے الفاظ ہیں جنہیں راویوں نے آگے منتقل کیا ہے۔ ان کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ وہ 'رسول اللہؐ کے الفاظ کا مفہوم' ہیں۔ یعنی رسول اللہؐ نے کچھ فرمایا، سننے والے صحابیؓ نے حضورؐ کے الفاظ کا جو مفہوم سمجھا اسے اپنے الفاظ میں آگے بیان کیا۔ راوی نے اس صحابیؓ کے الفاظ سے جو مطلب سمجھا اسے اپنے الفاظ میں آگے روایت کیا۔ اس طرح یہ مفہوم، مختلف راویوں کے الفاظ میں آگے منتقل ہوتا چلا گیا تا آنکہ آخری راوی کا بیان، حدیث کے مجموعہ میں شامل کر لیا گیا۔

ہر صحیح حدیث بھی واجب العمل نہیں

فرض کر لیجیئے کہ ان تمام مراحل سے گذرنے کے بعد، کسی حدیث کے متعلق اس پر اتفاق ہو جاتا ہے کہ وہ صحیح ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس کے بعد وہ حدیث سب کے نزدیک واجب العمل ہو جائے گی؟ آپ کہیں گے کہ اس میں اب کیا شبہ رہ جاتا ہے۔ اسے واجب العمل ہو جانا چاہیئے۔ لیکن نہیں۔ اس کے بعد ابھی ایک اور مرحلہ باقی ہے۔

جماعتِ اسلامی سے جو حضرات (۱۹۵۶ء میں) الگ ہوئے تھے۔ انہوں نے مودودی صاحب کے خلاف ایک الزام یہ بھی عائد کیا تھا کہ وہ جب تک نظری سیاست کی منزل میں رہے، دین کے مطابق اصولوں کی تبلیغ کرتے رہے۔ لیکن جب عملی سیاست کا وقت آیا تو کچھ اور ہی روش اختیار کر لی۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے لکھا کہ یہ بات کچھ میں نے انوکھی نہیں کی۔ (معاذ اللہ) خود نبی اکرمؐ نے بھی یہی کیا تھا۔ حضورؐ ساری عمر اخوت و مساوات کے اصولوں کی تبلیغ فرماتے رہے لیکن جب عملاً تشکیل حکومت کا وقت آیا تو آپؐ نے فرما دیا۔ "الائمۃ من قریش" خلافت قریش میں رہے گی۔ مودودی صاحب کے فریقِ مقابل (مولانا امین احسن صاحب اصلاحی) "الائمۃ من قریش" والی حدیث کو صحیح مانتے ہیں۔ لیکن انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہؐ کا یہ حکم مستقل نہیں تھا۔ آپؐ نے ایک قضیہ کا وقتی فیصلہ دیا تھا۔ اور

> ایک مستقل حکم دینے اور کسی قضیہ کا وقتی فیصلہ کرنے میں (بڑا باریک) فرق ہوتا ہے۔
> (میثاق۔ دسمبر ۱۹۵۹ء)

اس اصول کو خود مودودی صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ ان سے جب (ضبطِ ولادت کے سلسلہ میں) عزل کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ:-

> عزل کے متعلق جو کچھ آنحضورؐ سے پوچھا گیا اور اس کے جواب میں جو کچھ حضورؐ نے بیان فرمایا اس کا تعلق صرف انفرادی ضروریات اور استثنائی حالات سے تھا۔۔۔۔۔۔۔ عزل کی اجازت میں جو چند روایات مروی ہیں ان کی حقیقت بس یہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے اپنے ذاتی حالات یا مجبوری بیان کی اور آنحضورؐ نے انہیں سامنے رکھ کر کوئی مناسب جواب دے دیا۔ (ترجمان القرآن بابت اپریل ۱۹۶۰ء)

لہٰذا، جس حدیث کو صحیح تسلیم کر لیا جائے اس کے متعلق بھی یہ سوال پیدا ہوگا کہ حضورؐ کا وہ حکم مستقل تھا یا آپؐ نے ہنگامی، استثنائی یا انفرادی قضیہ کا فیصلہ کرنے کے لئے ایسا ارشاد فرمایا تھا۔ آخرالذکر کی صورت میں اس حکم کی اطاعت لازم نہیں آئے گی۔ اب سوچئے کہ اس کا فیصلہ کس طرح سے ہوگا کہ حضورؐ کا فلاں حکم مستقل نوعیت کا تھا یا ہنگامی اور انفرادی حیثیت رکھتا تھا؟ چنانچہ اصلاحی صاحب "الائمۃ من قریش" کے حکم کو ہنگامی قرار دیتے ہیں۔ اور مودودی صاحب مستقل۔ اسی طرح مودودی صاحب عزل کی اجازت کو انفرادی قرار دیتے ہیں اور ان کے فریقِ مقابل اسے عام اجازت تصور کرتے ہیں۔

حدیث، قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے

آپ کہہ دیں گے کہ حدیث کو پرکھنے کا سیدھا اور صاف طریقہ یہ ہے کہ جو حدیث، قرآن کریم کے خلاف جائے، اسے غلط قرار دے دیا جائے۔ یہ بات بڑی معقول نظر آتی ہے لیکن ہمارے علمائے کرام کا عقیدہ اس باب میں کچھ اور ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ حدیث، قرآن کریم کے خلاف بھی ہو سکتی ہے اور جب قرآن اور حدیث میں اختلاف ہو، تو حدیث قرآن کو منسوخ کر دیتی ہے۔ چنانچہ علامہ، مولوی، حافظ محمد ایوب صاحب دہلوی (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) اپنے کتابچہ، فتنۂ انکارِ حدیث، میں لکھتے ہیں:-

نبی کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تب تو حجت رہے اور مطابق نہ ہو تو حجت نہ رہے
......جس طرح قرآن کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہماری عقل کے مطابق ہو تو حجت ہو اور ہماری عقل کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہو۔ اسی طرح نبی کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تو حجت ہو اور قرآن کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہو۔ (ص ۵۴)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔

رہی یہ بات کہ قولِ رسول، قرآن کے خلاف ہو تو بھی وہ حجت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے ۔۔۔
كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ
(۲/۱۸۰) " تمہارے اوپر والدین کے لئے وصیت فرض ہے۔ اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جبکہ اسے موت آئے"۔ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ لَا وَصِيَّةَ لِلْوَارِثِ۔ وارث کے لئے وصیت نہیں ہے۔ اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے۔ یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دی گئی۔ حدیث نے قرآن کو منسوخ کر دیا اور قولِ رسولؐ، قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجب عمل رہا۔ (ص ۵۵)

اس کے بعد وہ اس کی علت سمجھاتے ہیں:۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ رسول کا کوئی قول قرآن کے خلاف ہو اور رسولؐ کا قول قرآن کو نسخ کر دے۔ تو پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ رسول کا قول اپنا قول نہیں ہوتا۔ وہ درحقیقت خدا کا قول ہوتا ہے جس طرح قرآن خدا کا قول ہے اسی طرح رسول کا قول بھی خدا کا قول ہے۔ اور جس طرح قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کو منسوخ کر دیتی ہے اسی طرح خدا کا ایک قول (یعنی قولِ رسول) دوسرے قول۔ یعنی قرآن کو منسوخ کر دیتا ہے۔ (ص ۵۶)

اس سے واضح ہے کہ ان حضرات کا عقیدہ ہے کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک قرآن کی بہت سی آیات ہیں جنہیں یا تو قرآن کی دوسری آیات نے منسوخ کر دیا ہے یا حدیث نے منسوخ کر دیا۔ اب ان آیات کی صرف تلاوت ہوتی ہے۔ ان پر عمل نہیں ہوتا۔

قرآن مکمل دین نہیں

ان حضرات کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اصولی طور پر بھی قرآن کریم دین کا مکمل ضابطہ نہیں۔ حدیث کی پوزیشن مثلِ معہٗ کی ہے۔ یعنی قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ۔ مودودی صاحب اس باب میں فرماتے ہیں:۔

حدیث کے مستقل ماخذ ہونے کی نفی سے اگر مراد یہ ہے کہ اس کی حیثیت صرف شارح اور مفسر کی ہے۔ یعنی وہ انہی مسائل و وقائع کی وضاحت کرتی ہے جن کا مجملاً قرآن میں ذکر آ گیا ہے اور خود اس کی اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں ہے تو یہ دعویٰ واقعہ کے خلاف ہے...... مسائل و احکام کے باب میں حدیث ایک مستقل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ (ترجمان القرآن۔ جولائی۔ اگست۔ ستمبر ۱۹۵۸ء)

اس مقام پر مودودی صاحب سے پوچھا گیا کہ جب دین کی تکمیل قرآن اور حدیث، دونوں کے مجموعے سے ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان احکام کو جو حدیث میں بیان ہوئے ہیں، قرآن ہی میں کیوں نہ بیان کر دیا تاکہ امت کے پاس دین

کا مکمل اور محفوظ ضابطہ موجود ہوتا۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ :۔

اس سے قرآنِ مجید کم از کم انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے برابر ضخیم ہو جاتا اور وہ تمام فوائد، باطل ہو جاتے جو اس کتاب کو محض ایک مختصر سی اصولی کتاب رکھنے سے حاصل ہوئے ہیں۔
(تفہیمات - حصہ اوّل - ص ۳۳۷)

یوں، "دین کے ایک غیر متبدل، ابدی حصہ" کو قرآن سے باہر، احادیث کے اندر رکھ دیا گیا اور احادیث کے مجموعوں سے اسے تلاش کرنے کا ذریعہ "مزاج شناس" کی نگاہِ بصیرت کے سپرد کر دیا گیا!

یہ ہے مختصراً حدیث کی پوزیشن ہمارے علمائے کرام کے اپنے الفاظ میں، ہم نے ہر اقتباس کے ساتھ حوالہ نقل کر دیا ہے تاکہ یہ نہ کہہ دیا جائے کہ ہم نے کچھ اپنی طرف سے لکھ دیا ہے یا توڑ مروڑ کر پیش کر دیا ہے۔ آپ ان حوالوں سے اصل عبارات نکال کر دیکھ لیں اور سیاق و سباق سے ملا کر اپنا اطمینان کر لیں۔

اتنا اور واضح کر دیا جائے کہ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ سُنی حضرات کا عقیدہ ہے۔ شیعہ حضرات سنیوں کی احادیث کے مجموعوں کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ان کی احادیث کے اپنے مجموعے ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب، ایک مستفسر کے جواب میں لکھتے ہیں :۔

آپ کو جو اس بات پر تعجب ہے کہ آخر واضح احادیث کی موجودگی میں وہ (شیعہ حضرات) کیونکر اپنی ہٹ پر قائم رہ سکتے ہیں تو آپ کو یہ تعجب غالباً اس غلط فہمی کے سبب سے ہے کہ آپ سمجھتے ہیں کہ حدیث کی جن کتابوں کو آپ مستند و معتبر مانتے ہیں۔ یہ حضرات بھی ان کو مستند و معتبر مانتے ہیں۔ اگر آپ اپنے ذہن میں یہ خیال رکھتے ہیں تو اس خیال کو ذہن سے نکال دیجئے۔ ان حضرات کی حدیث و فقہ، ہر چیز کے اپنے مجموعے ہیں جو ان کے اپنے خاص ذرائع سے نقل ہوئے ہیں۔ یہ انہی کو مستند و معتبر مانتے ہیں۔ اگ مجموعہ ہائے احادیث کو یہ کوئی وزن نہیں دیتے جو ہمارے ہاں معتبر ہیں۔

(میثاق - بابت مئی سنہ ۱۹۶۰ء)

ان حقائق کی روشنی میں آپ سوچئے کہ ان حضرات کا یہ مطالبہ کہ مملکت کے قوانین "قرآن و سنت" کے مطابق مرتب کر دیئے جائیں، عملاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟ ان میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ "سنت" کے معاملہ میں ان کے باہمی اختلافات بنیادی ہیں اور جس بات کو ایک فرقہ سنت قرار دیتا ہے دوسرا اسے سنت سمجھتا ہی نہیں۔ یعنی ان کا اس بنیاد پر بھی اتفاق نہیں کہ "سنت" کہتے کسے ہیں اور وہ کس کتاب میں ہے؟ ان حضرات کو اس حقیقت کا خود احساس ہے۔ اس کا انہوں نے حل یہ سوچا ہے کہ آئین میں یہ شق لکھ دی جائے کہ شخصی قوانین —

شخصی قوانین

(PERSONAL LAWS) میں قرآن و سنت کی تعبیر وہی لی جائے جو متعلقہ فرقے کے نزدیک قابلِ قبول ہو۔ (ہم اس سوال کو ذرا آگے چل کر سامنے لائیں گے کہ قرآن کی رو سے شخصی اور ملکی قانون کی تفریق ہی غلط ہے۔ سرِدست یہ دیکھئے کہ) اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ شخصی قانون کی صورت میں ہر فرقہ کی الگ الگ تعبیر قابلِ قبول ہوگی تو ملکی قانون کا مسئلہ کس طرح حل

ہوگا؟ اس لئے کہ کتاب و سنت کی مطابقت کی شرط ملکی قوانین پر اسی طرح عائد ہوگی جس طرح شخصی قانون پر۔ یہ فیصلہ کون کرے گا کہ فلاں ملکی قانون مطابق سنت ہے یا نہیں جبکہ مملکت کے سامنے سنت کی کوئی جامع تعریف یا کتاب ہی نہیں ہوگی۔ ان حضرات نے یہ مطالبہ پیش کرکے کہ شخصی قوانین میں ہر فرقہ کی "کتاب و سنت" کی الگ الگ تعبیر تسلیم کرلی جائے، اس امر کا اعلان کردیا ہے کہ کتاب و سنت سے شخصی قوانین بھی ایسے نہیں بنائے جا سکتے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہوں۔ اس سے لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کتاب و سنت سے شخصی قوانین بھی متفق علیہ نہیں بن سکتے (یعنی کتاب و سنت کی رو سے نکاح اور طلاق وغیرہ سے متعلق قوانین بھی ایسے نہیں بن سکتے جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہوں) تو اسی کتاب و سنت کی رو سے متفق علیہ ملکی قوانین کس طرح بن سکیں گے؟ اس کا جواب ان میں سے کوئی نہیں دیتا لیکن اس کے باوجود اس مطالبہ کو ہر ایک دہرائے چلا جا رہا ہے۔

یہ ہے وہ طریق جس کے مطابق یہ حضرات آئین جیسے اہم اور پیچیدہ مسئلہ کی اس بنیادی شق سے یوں آنکھیں بند کرکے گزر جانا چاہتے ہیں۔ اور جو شخص حقائق کا سامنا کرنے کے بعد ان سے دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کا حل کیا ہے اس کے متعلق شور مچا دیا جاتا ہے کہ یہ منکرِ حدیث ہے۔ منکرِ شانِ رسالت ہے۔ ہم ان حضرات کی خدمت میں بادب گزارش کریں گے کہ اس قسم کی ہنگامہ آرائی سے ایسے اہم مسائل حل نہیں ہوا کرتے۔ یہ آئین کا بنیادی مسئلہ ہے جس کا حل آپ کو ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیئے۔ اگر آپ حضرات، طلوعِ اسلام کو گالیاں دینے کے بجائے، اس تمام عرصہ میں۔

کرنے کا کام

(i) "سنتِ رسول اللہؐ" کی ایسی تعریف (DEFINITION) مرتب کردیتے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہوتی۔ اور

(ii) کسی ایسی کتاب کی نشان دہی کر دیتے جس میں پوری کی پوری سنتِ رسول اللہؐ درج ہوتی اور اس کتاب کا متن سب کے نزدیک قرآن کے متن کی طرح، متفق علیہ اور تنقید سے بالا ہوتا۔ تو آپ کہہ سکتے تھے کہ ہم نے ایک متفق علیہ مطالبہ پیش کر دیا ہے۔ لیکن جب حقیقت یہ ہو کہ مطالبہ پیش کرنے والے اس خشتِ اوّل ہی پر متفق نہ ہوں کہ سنت کہتے کسے ہیں اور کہاں سے ملے گی تو ان کے مطالبہ کو متفق علیہ کہنا خود فریبی نہیں تو اور کیا ہے۔

ہمیں اس کا احساس ہے کہ یہ کچھ دیکھ کر آپ یقیناً سر پکڑ کر بیٹھ جائیں گے اور بے ساختہ پکار اٹھیں گے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ اسلامی قوانین مرتب ہی نہیں ہو سکتے، وہ سچے ہیں۔ بنا بریں کشود کی راہ یہی ہے کہ ان خاردار جھاڑیوں سے الگ رہتے ہوئے، جس طرح باقی دنیا قوانین بناتی ہے ہم بھی ویسے ہی قوانین بنا لیں۔

سیکولر آئین

اسلامی قوانین کے سلسلہ میں جو مطالبہ ہمارے علمائے کرام پیش کرتے ہیں، اس کی رو سے کوئی شخص مندرجہ بالا نتیجہ کے سوا کسی اور نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ علمائے کرام کا یہی اصرار تھا جس سے تنگ آکر ترکی کو سیکولر آئین اختیار کرنا پڑا تھا۔ اور یہی وہ دشواری ہے جس کا حل

سامنے نہ ہونے سے پاکستان میں سیکولر آئین کی آوازیں کان میں پڑتی ہیں۔

لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ صحیح اسلامی قوانین جو حقائق کی روشنی میں قابلِ عمل ہوں، مرتب ہی نہیں کئے جا سکتے۔ انہیں مرتب کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہم پہلے یہ سمجھ لیں کہ قوانین سازی کے معاملہ میں اسلام کا منشاء کیا ہے۔

مسئلہ کا حل

طلوعِ اسلام کا کہنا یہ ہے کہ خدا اور رسولؐ کا منشاء یہ تھا کہ اسلامی قوانین کی بنیاد قرآن کے غیر متبدل اصولوں پر رکھی جائے جن کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے مملکت اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق کاروبار چلائے۔ علمائے کرام کا کہنا یہ ہے کہ قوانین کی بنیاد کتاب و سنت یا قرآن اور حدیث پر رکھی جائے اور دونوں کو غیر متبدل اور ابدی قرار دیا جائے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن کے ساتھ احادیث کو بھی دین کا ابدی اور غیر متبدل حصہ قرار پانا تھا تو:-

(i) کیا اللہ تعالےٰ کے لئے ضروری نہیں تھا کہ جس طرح اس نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود لیا تھا، احادیث کی حفاظت کا ذمہ بھی لیتا۔ اور

(ii) کیا نبی اکرمؐ کا یہ فریضۂ رسالت نہیں تھا کہ آپ قرآن کے ساتھ اپنی احادیث کا مجموعہ بھی اُمت کو دے جاتے تاکہ یہ دونوں چیزیں اُمت کے پاس متفقہ طور پر ہمیشہ کے لئے محفوظ رہتیں اور اس قسم کا کوئی الجھاؤ پیدا نہ ہوتا جو سنت اور حدیث کے بارے میں گذشتہ صفحات میں آپ کے سامنے آیا ہے؟ جب رسولؐ اللہ نے ایسا کوئی مجموعہ اُمت کو نہیں دیا تو اس سے انسان لامحالہ دو نتیجوں میں سے کسی ایک پر پہنچتا ہے۔ یعنی:-

منشائے نبویؐ

(i) یا تو (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) حضورؐ سے سہواً یہ کام رہ گیا۔

(ii) اور یا حضورؐ نے دانستہ ایسا کیا۔

پہلے نتیجہ کا تو کوئی مسلمان تصور تک بھی نہیں کر سکتا۔ اس لئے دوسری بات ہی باقی رہ جاتی ہے کہ منشائے رسالت ہی یہ تھا کہ اُمت قرآن کریم کی راہ نمائی میں آگے چلے۔ چنانچہ واقعات خود اس کی شہادت دیتے ہیں۔ مثلاً:-

(۱) مسلم کی حدیث ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ لا تکتبوا عنی و من کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ۔ "مجھ سے نہ لکھو اور جس شخص نے مجھ سے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو وہ اسے مٹا دے۔" اس سے ظاہر ہے کہ نبی اکرمؐ نے صرف قرآن کریم کی کتابت کرائی تھی۔ احادیث کو لکھنے سے منع فرما دیا تھا۔ خود یہ واقعہ کہ حضورؐ نے احادیث کا کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا اس کا بیّن ثبوت ہے کہ حضورؐ نے احادیث کی کتابت نہیں کرائی تھی۔

(۲) بخاری میں حضرت عبدالعزیز بن رفیع سے روایت ہے کہ میں اور شداد بن معقل حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر شداد بن معقل نے ان سے دریافت کیا۔ "کیا آنحضرتؐ نے کوئی چیز چھوڑی تھی؟" انہوں نے جواب دیا آپ نے مابین الدفتین (یعنی مجلد قرآن کریم) کے علاوہ کچھ نہیں چھوڑا۔ عبدالعزیز بن رفیع کہتے ہیں کہ پھر ہم دونوں محمد بن حنفیہؒ کی خدمت میں پہنچے اور ان سے بھی یہی بات دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ "آپؐ نے مابین الدفتین کے سوا کچھ نہیں چھوڑا۔"

اس مقام پر اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ جو عام طور پر مشہور ہے کہ نبی اکرمؐ کی وفات کے وقت قرآن کریم مدون (کتابی) شکل میں نہیں تھا۔ اسے، حضرت ابوبکرؓ صدیق کے زمانہ میں جمع اور مرتب کیا گیا تھا تو یہ خیال خود قرآن کریم اور واقعات کے خلاف ہے۔ نبی اکرمؐ نے قرآن کریم، اسی شکل میں جس میں وہ اس وقت ہمارے پاس موجود ہے، امت کو دیا تھا۔ اور قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز امت کو نہیں دی تھی۔

خلفائے راشدینؓ کا عمل

نبی اکرمؐ کے بعد، خلفائے راشدینؓ کا زمانہ آتا ہے۔ اس دور کے متعلق علامہ محمد الخضری مصری (مرحوم) اپنی کتاب تاریخ التشریع الاسلامی (اردو ترجمہ شائع کردہ دار المصنفین) میں لکھتے ہیں:۔

(۳) حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں مراسیل ابن ابی ملیکہ سے یہ روایت کی ہے کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم لوگ رسول اللہؐ سے ایسی حدیثیں روایت کرتے ہو جن میں تم لوگوں میں اختلاف ہوتا ہے اور تمہارے بعد جو لوگ ہوں گے ان میں اس سے بھی زیادہ اختلاف ہوگا تو رسول اللہ سے کوئی حدیث روایت نہ کرو۔ جو شخص تم سے سوال کرے اس سے کہو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان خدا کی کتاب ہے۔ اس کے حلال کئے ہوئے کو حلال اور اس کے حرام کئے ہوئے کو حرام سمجھو۔ (ص ۱۶۱)

اس کے بعد حضرت عمرؓ کا زمانہ آتا ہے۔ اس کے متعلق علامہ خضری لکھتے ہیں:۔

(۴) اس کے بعد تنویر الحوالک شرح مؤطا امام مالکؒ میں ایک روایت ہے، جس کا سلسلہ حضرت عروہ بن زبیرؓ تک منتہی ہوتا ہے، یہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے احادیث کو لکھوانا چاہا اور اس بارے میں اصحاب رسول اللہؐ سے مشورہ کیا تو تمام صحابہؓ نے اس کا مشورہ دیا۔ لیکن وہ ایک ماہ تک خود غیر متیقن طور پر اس معاملہ میں استخارہ کرتے رہے۔ اس کے بعد ایک دن انھوں نے یقینی رائے قائم کر لی اور فرمایا کہ میں نے جیسا کہ تم لوگوں کو معلوم ہے تم سے تحریر احادیث کا ذکر کیا تھا۔ پھر میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ تم سے پہلے اہل کتاب میں سے بہت سے لوگوں نے کتاب اللہ کے ساتھ اور کتابیں لکھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انہی کتابوں میں مشغول ہو گئے اور کتاب اللہ کو چھوڑ دیا۔ اس بنا پر۔ خدا کی قسم میں کتاب اللہ کو کسی اور چیز کے ساتھ مخلوط نہیں کرونگا۔ اس لئے انہوں نے تحریر احادیث کا کام چھوڑ دیا۔[1] (ص ۱۶۳)

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ صورت حالات یہ نہیں کہ عہد رسالت مآبؐ اور دور خلافت راشدہ میں جمع و تدوین احادیث کا کام سہواً رہ گیا تھا اور بعد میں امام بخاریؒ نے اسے پورا کر کے، دین کے ایک اہم جزو کو محفوظ کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے اسے دین کا ابدی جزو قرار ہی نہیں دیا تھا۔ اور نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے اسے ایسا سمجھا تھا۔ یہ خیال بہت بعد کی پیداوار ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر یہ دین کا ابدی اور

---

[1] تدوین احادیث کی تفصیلی بحث ہماری کتاب "مقام حدیث" اور "شاہکار رسالت" کے آخری باب میں ملے گی۔

غیر متبدل حصہ ہوتا تو عہدِ رسالتؐ مآب اور زمانۂ خلافتِ راشدہ میں اسے محفوظ کیوں نہ کر دیا جاتا؟ نبی اکرمؐ نے اُمت کو قرآن کریم ہی دیا تھا اور اسی پر اسلامی مملکت (خلافتِ راشدہ) نے اپنے "آئین" کی بنیاد رکھی۔ اس لئے کہ، جیساکہ مودودی صاحب نے بھی لکھا ہے:۔

قرآن کی پوزیشن

دین کے اصول سب کے سب کتاب اللہ میں موجود ہیں جو روایات سے بالاتر اور سب مسلمانوں میں مشترک ہیں۔

(تفہیمات۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۳۲۹)

وہ رسائل و مسائل (حصہ اول) میں لکھتے ہیں:۔

یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جن چیزوں پر کفر و اسلام کا مدار ہے اور جن امور پر انسان کی نجات موقوف ہے انہیں بیان کرنے کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے وہ سب قرآن میں بیان کی گئی ہیں۔ اور قرآن میں بھی ان کو کچھ اشارۃً و کنایۃً بیان نہیں کیا گیا۔ بلکہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ ان علینا للھدیٰ۔ (صفحہ ۶۷)

وہ اپنی تفسیر، تفہیم القرآن (جلد اوّل۔ صفحہ ۵۹۰) میں لکھتے ہیں:۔

حرام اور حلال .... جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنا۔ اور انسانی زندگی کے لئے قانون اور شرع تجویز کرنا، یہ سب خداوندی کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں سے کسی کو غیر اللہ کے لئے تسلیم کرنا شرک ہے

اس حقیقت کی تشریح کرتے ہوئے وہ تفہیمات حصہ دوم (صفحہ ۳۸۹) میں لکھتے ہیں:۔

اسی اصل کی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے جو ابوداؤد نے سلمان فارسیؓ سے بدیں الفاظ نقل کی ہے کہ ... رسول اللہؐ نے فرمایا کہ، الحلال ما احل اللہ فی کتابہ والحرام ما حرم اللہ فی کتابہ وما سکت عنہ فھو مما عفا عنہ۔ حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا۔ رہی وہ چیزیں جن کا ذکر نہیں کیا گیا۔ تو وہ معاف ہیں۔

قرآن کریم کا اندازِ بیان ایسا صاف۔ سیدھا اور واضح ہے کہ اس کے سمجھنے میں کسی قسم کا ابہام نہیں رہتا۔ مودودی صاحب کے الفاظ ہیں:

قرآن کریم اپنے مدعا کو بغیر کسی ابہام کے صاف صاف بیان کرتا ہے اور اس نے کسی ایسی حقیقت کو جس کا جاننا آدمی کے لئے ضروری تھا واضح کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ بابت اپریل۔ مئی ۱۹۵۲ء)

قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے کسی تفسیر کی بھی ضرورت نہیں۔

قرآن کے لئے کسی تفسیر کی حاجت نہیں۔ اس کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے جس نے قرآن کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہو اور جو طرزِ جدید پر قرآن پڑھانے اور سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو۔

(تنقیحات۔ صفحہ ۱۹۳)

قرآن کو خود قرآن سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا امین احسن صاحب اصلاحی فرماتے ہیں:۔

قرآن کے اندر اسرارِ حکمت کا لاریب ایک خزانہ ہے۔ لیکن اس خزانہ کی کلید خود قرآن ہی کے ارشادات و الفاظ ہیں۔ قرآن سے باہر ان کی کلید نہیں۔ قرآن کے علوم کا ایک حصہ اس کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے ——— ——— ایک حصہ اس کے اشارات سے کھلتا ہے۔ ایک بہت بڑا حصہ اس کے سیاق و سباق سے بے نقاب ہوتا ہے۔ اور پھر سب سے بڑا خزانہ اس کے نظام کی معرفت سے سامنے آتا ہے۔ جو لوگ قرآن پر تدبر کرتے ہیں وہ بقدر استعداد اس سے فیض پاتے ہیں۔ وہ اپنی ہر بات پر قرآن ہی کے الفاظ و اشارات اور سیاق و نظام سے دلیل لاتے ہیں۔

(ترجمان القرآن بابت فروری ۱۹۵۳ء)

دین کی جزئیات

اب اس سلسلہ میں ہمارے سامنے وہ اہم سوال آتا ہے جو اکثر ذہنوں کے لئے پریشانی کا موجب بنتا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ قرآن کریم نے اکثر و بیشتر دین کے اصول دیئے ہیں۔ ان کی جزئیات متعین نہیں کیں۔ یہ جزئیات نبی اکرمؐ نے متعین فرمائیں۔ اگر سنتِ رسول اللہ کو آئین و قوانین کی بنیاد نہ قرار دیا جائے تو ان کی جزئیات کو کہاں سے لیا جائے گا؟[1]

اس سلسلہ میں غور طلب نکتہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے جب دین کے صرف اصول دیئے اور ان کی جزئیات کو خود متعین نہیں کیا، تو کیا اس نے ایسا دانستہ کیا تھا، یا یہ (معاذ اللہ) سہواً رہ گیا تھا؟ اس سوال کا جواب ہم سے نہیں بلکہ مودودی صاحب کی زبانِ قلم سے سنیئے۔ وہ اپنی تفسیر، تفہیم القرآن (جلد اوّل) کے صفحات ۵۰۸-۵۰۷ پر لکھتے ہیں:-

ایک دوسری حدیث میں ہے ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا و حرم حرمات فلا تنتھکوھا وحد حدودا فلا تعتدوھا و سکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض تم پر عائد کئے ہیں انہیں ضائع نہ کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے ان کے پاس نہ پھٹکو۔ کچھ حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے۔ بغیر اس کے کہ اسے بھول لاحق ہوئی ہے۔ لہٰذا ان کی کھوج نہ لگاؤ۔

ان دونوں حدیثوں میں ایک اہم حقیقت پر متنبہ کیا گیا ہے۔ جن امور کو شارع نے مجملاً بیان کیا ہے اور ان کی تفصیل نہیں بتائی یا جو احکام بر سبیلِ اجمال دیئے ہیں اور مقدار یا تعداد یا دوسرے تعینات کا ذکر نہیں کیا ہے ان میں اجمال اور عدمِ تفصیل کی وجہ یہ نہیں ہے کہ شارع سے بھول ہو گئی۔ تفصیلات بتانی چاہئیں تھیں مگر نہ بتائیں۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ شارع ان امور کی تفصیلات کو محدود نہیں

---

[1] مذہبی مکتبوں کے طالب علموں کی زبان سے آپ یہ اعتراض ہر مقام پر سنیں گے کہ اگر حدیث کو نہ مانا جائے تو ہم نماز کس طرح پڑھ سکیں گے؟ وقس علیٰ ھٰذا۔

کرنا چاہتا اور احکام میں لوگوں کے لئے وسعت رکھنا چاہتا ہے۔ اب جو شخص خواہ مخواہ سوال پر سوال نکال کر تفصیلات اور تعینات اور تقییدات بڑھانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر شارع کے کلام سے یہ چیزیں کسی طرح نہیں نکلتیں تو قیاس سے، استنباط سے، کسی نہ کسی طرح مجمل کو مفصّل، مطلق کو مقید، غیر معین کو معین بنا کر ہی چھوڑتا ہے۔ وہ درحقیقت مسلمانوں کو بڑے خطرے میں ڈالتا ہے (یہودیوں نے ایسا ہی کیا) جن کے نقشِ قدم پر چلنے میں قرآن اور محمد صلعم کی تنبیہات کے باوجود مسلمانوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔

یعنی اگر اللہ تعالےٰ نے ان اصولوں کی جزئیات و تفصیلات خود نہیں بتائیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ "وہ ان امور کی تفصیلات کو محدود نہیں کرنا چاہتا۔ اور احکام میں لوگوں کے لئے وسعت رکھنا چاہتا ہے۔" خدا کی آخری کتاب کے لئے، جسے اقوامِ عالم کے لئے، ہر ملک اور ہر زمانے میں ابدی ضابطۂ حیات بننا تھا۔ ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا' اسے زندگی کے ایسے اصول دینے چاہئیں تھے جو ہر زمانے میں نوعِ انسان کے لئے راہ نمائی کا کام دے سکیں اور ان کی جزئیات کو غیر متعین چھوڑ دینا چاہیئے تھا تاکہ ہر زمانے کے لوگ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، انہیں خود مرتب کریں۔ یہ اصول غیر متبدل رہتے اور ان کی چار دیواری کے اندر مرتب کردہ جزئیات میں حسبِ ضرورت تبدیلی ہوتی رہتی۔ اس طرح ثبات و تغیر کے حسین امتزاج سے، کاروانِ انسانیت زندگی کے ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا چلا جاتا۔ علامہ اقبالؒ اس ضمن میں اپنے خطبات (تشکیلِ جدید) میں رقمطراز ہیں:۔

جزئیات غیر متبدل نہیں ہوتیں

اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس ازلی و ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں..... لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے کے اندر تغیر کا امکان ہی نہیں تو اس سے زندگی' جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد اور متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

قرآنِ کریم کے ان غیر متبدل اصولوں کی جزئیات سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق مرتب فرمائیں۔ ان جزئیات کا ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھا جانا، نہ مقصودِ دین تھا، نہ منشائے رسالت۔ یہ وجہ تھی جو حضورؐ نے ان جزئیات کو مدون کرکے ان کا (اپنی احادیث کا) مجموعہ امت کو نہ دیا۔ اور نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے ایسا کیا۔ اس کے برعکس ہمیں تاریخ میں متعدد واقعات ایسے ملتے ہیں، جن میں

خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں ان جزئیات میں ردّ و بدل کیا گیا۔[1] علامہ اقبالؒ اس باب میں لکھتے ہیں:۔

احادیث کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اوّل الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانۂ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا ہے۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو ان کے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالم گیر اصول عطا کر دے۔ نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلکِ زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالم گیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریقِ کار کی رو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خود مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ انہیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امامِ اعظمؒ ابوحنیفہ نے (جو اسلام کی عالم گیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث سے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ اُن کے زمانے میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اول تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہریؒ کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحبؒ تک نہیں پہنچ پائے تھے یا ان

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے۔ "شاہکارِ رسالت" ۳۔

میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں تو اگر امام صاحبؒ اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں میں یہ بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔

(خطباتِ اقبالؒ - صفحہ ۱۶۴ - ۱۶۳)

نبی اکرمؐ کے زمانے کے احکام میں تغیر و تبدل کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں:-

مودودی صاحب اور جزئیاتِ دین

یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجا آوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات اور تمام حالات میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسی بھی ہیں جن میں تغیرِ حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صحابہؓ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے، لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانہ اور ہر ملک کے ہوں۔ لہٰذا احکامِ اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں۔ ان کو ہو بہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح اور حکم کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے۔ جس کو روحِ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں ..... پس معلوم ہوا کہ جزئیات میں دلالۃ النص اور اشارۃ النص تو درکنار صراحۃ النص کی پیروی بھی تفقہ کے بغیر درست نہیں ہوتی اور تفقہ کا اقتضاء یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ میں شارع کے مقاصد و مصالح پر نظر رکھے اور انہی کے لحاظ سے جزئیات میں تغیرِ احوال کے ساتھ ایسا تغیر کرتا رہے جو شارع کے اصولِ تشریع پر مبنی اور اس کے طرزِ عمل سے اقرب ہو۔

تفہیمات - حصہ دوم - صفحہ ۳۲۷-۳۲۸)

وہ اس کی تفصیل میں دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:-

مدینہ طیبہ سے مماثلت پیدا کرنے کا مفہوم کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم ظاہر اشکال میں مماثلت پیدا کرنا چاہتے ہیں اور دلیا اس وقت تمدن کے جس مرتبہ پر ہے اس سے رجعت کرکے اس تمدنی مرتبہ پر واپس جانے کے خواہشمند ہیں جو عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھا۔ اتباعِ رسولؐ کا یہ مفہوم ہی سرے سے غلط ہے اور اکثر دیندار لوگ غلطی سے اس کا یہی مفہوم لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک سلفِ صالحین کی پیروی اس کا نام ہے کہ تمدن و حضارت کی جو حالت ان کے عہد میں تھی اس کو ہم بالکل متحجر (FOSCILISED) صورت میں قیامت تک باقی رکھنے کی کوشش کریں اور ہمارے اس ماحول سے

> باہر کی دنیا میں جو تغیرات واقع ہو رہے ہیں ان سب سے آنکھیں بند کرکے ہم اپنے دماغ اور اپنی زندگی کے اردگرد ایک حصار کھینچ لیں جس کی سرحد میں وقت کی حرکت اور زمانے کے تغیر کو داخل ہونے کی اجازت نہ ہو۔ اتباع کا یہ تصور جو دورِ انحطاط کی کئی صدیوں سے دیندار مسلمانوں کے دماغوں پر مسلّط ہے، درحقیقت روحِ اسلام کے بالکل منافی ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ ہم جیتے جاگتے آثارِ قدیمہ بن کر رہیں اور اپنی زندگی کو قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈرامہ بنائے رکھیں۔ وہ ہمیں رہبانیت اور قدامت پرستی نہیں سکھاتا۔ اس کا مقصد دنیا میں ایک ایسی قوم پیدا کرنا نہیں جو تغیر و ارتقاء کو روکنے کی کوشش کرتی رہے بلکہ اس کے برعکس وہ ایک ایسی قوم بنانا چاہتا ہے جو تغیر و ارتقاء کو غلط راستوں سے روک کر صحیح راستوں پر چلانے کی کوشش کرے۔ وہ ہم کو قالب نہیں دیتا بلکہ روح دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ زمان و مکان کے تغیرات سے زندگی کے جتنے بھی مختلف قالب قیامت تک پیدا ہوں، ان سب میں یہی روح بھرتے چلے جائیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں ہمارا اصلی مشن یہی ہے کہ ہم کو "خیر اُمّۃ" جو بنایا گیا ہے تو یہ اس لئے نہیں کہ ہم ارتقاء کے راستے میں آگے بڑھنے والوں کے پیچھے عقب لشکر (REAR-GUARD) کی حیثیت میں لگے رہیں۔ بلکہ ہمارا کام امامت و رہنمائی ہے۔ ہم مقدمۃ الجیش بننے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور ہمارے "خیر اُمّۃ" ہونے کا راز "اخرجت للناس" میں پوشیدہ ہے۔ رسول اللہ اور آپؐ کے صحابہؓ کا اصلی اسوہ جس کی پیروی ہمیں کرنی چاہیئے یہ ہے کہ انہوں نے قوانینِ طبعی کو قوانینِ شرعی کے تحت کرکے زمین میں خدا کی خلافت کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ ان کے عہد میں جو تمدن تھا انہوں نے اس کے قالب میں روح پھونکی —— پس نبیؐ اور اصحابؓ نبی کا صحیح اتباع یہ ہے کہ تمدن کے ارتقاء اور قوانینِ طبعی کے انکشافات سے اب جو وسائل پیدا ہوئے ہیں ان کو ہم اسی طرح تہذیبِ اسلامی کا خادم بنانے کی کوشش کریں جس طرح صدرِ اول میں کی گئی تھی۔ نجاست اور گندگی جو کچھ ہے وہ ان وسائل میں نہیں ہے، بلکہ کافرانہ تہذیب میں ہے جو ان وسائل سے فروغ پا رہی ہے۔
>
> (نشانِ راہ - ص۵۵) ح۱

دوسرے مقام پر وہ لکھتے ہیں کہ "عبادات" کے علاوہ دیگر احکام کی جزئیات ہم خود متعین کر سکتے ہیں:-

اب رہ گئے احکام، تو قرآنِ مجید میں ان کے متعلق زیادہ کلی قوانین بیان کئے گئے ہیں اور بیشتر امور میں تفصیلات کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے عملاً ان احکام کو زندگی کے معاملات میں جاری فرمایا اور اپنے عمل اور قول سے ان کی تفصیلات ظاہر فرمائیں۔ ان تفصیلات میں بعض ح۲ ایسی ہیں جن میں ہمارے اجتہاد کو کوئی دخل نہیں۔ ہم پر لازم ہے کہ جیسا عمل حضورؐ سے ثابت ہے اسی کی پیروی کریں ——

ح۱ اس وقت اصل کتاب ہمارے سامنے نہیں ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ حوالہ میں کچھ فرق رہ گیا ہو۔

ح۲ اس کی تفریق و تخصیص کون کرے گا؟ لامحالہ مملکتِ اسلامیہ۔

مثلاً عبادات کے احکام اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم اصول اخذ کر کے اپنے اجتہاد سے فروع مستنبط کر سکتے ہیں۔ مثلاً عہدِ نبوی کے قوانین[1] مدنی۔ اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم کو اسلام کی اسپرٹ معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہ اسپرٹ ہمارے قلب و روح میں جاری و ساری ہو جائے تو ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ زندگی کے جملہ معاملات اور مسائل پہ ایک مسلمان کی سی حیثیت اور ایک مسلمان کی سی بصیرت کے ساتھ غور کریں۔ دنیا کے علمی اور عملی مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھیں اور ان کے متعلق وہی رائے قائم کریں جیسی ایک مسلمان کو کرنی چاہیئے۔

(تفہیمات۔ حصہ اول - صفحہ ۳۲۳-۳۲۴)

طلوعِ اسلام کی دعوت

طلوعِ اسلام کی دعوت یہی ہے کہ قوانینِ مملکت کی اساس و بنیاد قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کو قرار دیا جائے اور ان اصولوں کی جزئیات مرتب کرتے وقت، ہم اس تمام ذخیرہ کو اپنے سامنے رکھیں جو اسلاف سے ہم تک منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس میں جو کچھ ایسا ہو جو ہماری ضروریات کو آج بھی پورا کرتا ہے اسے علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے۔ جس میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہو اس میں تبدیلی کر لی جائے اور جو نئے معاملات سامنے آئیں ان کے لئے نئی جزئیات مرتب کر لی جائیں۔ مودودی صاحب اس باب میں لکھتے ہیں :-

اب اگر کوئی ایسا حادثہ پیش آتا ہے جو صحابہؓ یا ائمہ کے دور میں پیش نہیں آیا، یا کوئی ایسی چیز ایجاد ہوتی ہے جو اُس دور میں موجود ہی نہ تھی تو اس کے متعلق متقدمین کے اجتہادی احکام میں کوئی حکم تلاش کرنا بداہتہً غلط ہے۔ ایسے ہر حادثے اور ہر چیز کے لئے ہم کو بھی اسی طرح اصول و کلیات کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جس طرح صحابہؓ اور ائمہؒ نے اپنے عہد کے حوادث میں کیا تھا۔

(تفہیمات - حصہ دوم - صفحہ ۳۸۷)

مولانا اصلاحی صاحب کا مسلک یہ ہے کہ قرآن ہی میں نہیں بلکہ حدیث میں بھی بیشتر اصول ہی دیئے گئے ہیں اور جزئیات کا تعین اُمت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

قرآن و حدیث کے اندر بیشتر صرف بنیادی اصولی باتیں ہی بیان کی گئی ہیں۔ جزئیات و تفصیلات سے ان میں بہت کم تعرض کیا گیا ہے۔ اس خلاء کو حالات و ضروریات کے تحت بھرنا نیز تمام پیش آنے والے اجتماعی اور سیاسی معاملات میں اسلام کے منشاء اور مزاج کے مطابق قوانین بنانا اُمت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن - اپریل ۱۹۵۳ء)

نگہ باز گشت

سنتِ رسول اللہ کے متعلق جو کچھ گذشتہ صفحات میں بیان کیا گیا ہے اس سے یہ حقیقت آپ

---

[1] اس وقت سوال "قوانینِ مدنی" مقرر کرنے ہی کا ہے۔

سے کے سامنے آ گئی ہو گی کہ :-

۱۔ "سنت کسے کہتے ہیں" اس کے متعلق یہ حضرات آپس میں متفق نہیں۔

۲۔ ایسی کوئی کتاب موجود نہیں جس میں سنتِ رسول اللہؐ بہ تمام و کمال درج ہو اور جس کا متن، تمام فرقوں کے نزدیک، قرآن کریم کے متن کی طرح، متفق علیہ اور تنقید سے بالا ہو۔ حتیٰ کہ حدیث کا بھی ایسا مجموعہ نہیں جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔

۳۔ علمائے اہلِ حدیث کا مسلک اور عقیدہ یہ ہے کہ دین کی جزئیات بھی خدا کی طرف سے بذریعہ وحی، رسول اللہؐ کو عطا ہوئی تھیں۔ یہ جزئیات احادیث کے مجموعہ، بخاری و مسلم میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے کسی حدیث کا انکار بھی کفر ہے اور کسی نئی بات کا اختیار کرنا بدعت۔ اسی کا نام "سنتِ رسول اللہ" ہے۔

۴۔ مودودی صاحب کے نزدیک، ہر حدیث سنت نہیں۔ سنت وہ ہے جس پر رسول اللہؐ نے بہ حیثیتِ رسول عمل فرمایا ہو۔ اس کا فیصلہ مزاج شناسِ رسول کی نگاہِ بصیرت کر سکتی ہے کہ احادیث کی کتابوں میں جو کچھ آیا ہے اس میں کونسی حدیث صحیح اور کونسی غلط ہے۔ اور صحیح حدیثوں میں سے کونسی بات نبی اکرمؐ نے بہ حیثیتِ رسولؐ کی تھی اور کونسی اپنی شخصی حیثیت سے۔ جو باتیں حضورؐ نے بہ حیثیتِ رسول کی تھیں انھیں بھی بجز عبادات کے، ہو بہو قائم رکھنا مقصود نہیں۔ ان میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق رد و بدل کیا جا سکتا ہے۔ اور نئے حوادث کے سلسلہ میں جدید جزئیات بھی مرتب کی جا سکتی ہیں۔ اور

۵۔ مولانا اصلاحی کے نزدیک، قرآن و حدیث میں بھی بیشتر اصول ہی دیئے گئے ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں جزئیات مرتب کرنا امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ جو جزئیات رسول اللہ نے مرتب فرمائیں تھیں ان میں سے سنت وہ ہیں جنہیں حضورؐ نے استمراراً کیا ہو۔ ہنگامی حالات میں وقتی قضیوں کے فیصلے کے طور پر ارشاد فرمایا ہو۔ اس کا فیصلہ (کہ حضورؐ نے کونسی بات استمراراً کی تھی اور کونسی ہنگامی حالات کے ماتحت) غالباً یہ حضرات خود کریں گے۔

"سنت" کے مفہوم کے متعلق اس قدر باہمدگر اختلافات کے باوجود، ان حضرات کا دعویٰ کہ ہم نے قوانینِ پاکستان کے متعلق متفق علیہ مطالبہ پیش کر دیا ہے! اصل یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک قدرِ مشترک صرف "سنت" کا لفظ ہے۔ اس کا مفہوم ہر ایک کے نزدیک الگ الگ ہے۔ اگر طلوعِ اسلام چاہتا تو وہ بھی نہایت دھڑلے سے کہہ سکتا تھا کہ قوانینِ اسلامی کی بنیاد کتاب و سنت پر ہونی چاہیئے، اور جب کوئی پوچھتا تو (مودودی صاحب کی طرح) کہہ دیتا کہ ہمارے نزدیک سنت وہی ہے جسے ہماری نگاہ بصیرت سنت کہہ دے۔ اس طرح "سنت" کے مطالبہ کی ہمنوائی سے وہ بھی انہی کی طرح "حامیٔ سنت" قرار پا جاتا اور اس کے خلاف ایک انگلی تک نہ اٹھتی۔ لیکن طلوعِ اسلام دین کے معاملہ میں اس قسم کے کھیل کھیلنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ اس سے ہر ایک کو محفوظ رکھے۔ وہ دل و جان سے چاہتا ہے کہ پاکستان میں اسلامی قوانین کا نفاذ ہو اور اس کے لئے وہی راستہ تجویز کرتا ہے جو ممکن العمل بھی ہے اور منشاءِ اسلام بھی۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ قوانین کی بنیاد قرآنِ مجید ہونی چاہیئے تو اس کے خلاف اعتراض یہ اٹھایا جاتا ہے کہ قرآن کی کسی آیت کے قرآنی آیت ہونے میں تو کسی کو اختلاف نہیں ہوگا، لیکن اس کی تعبیر میں تو اختلاف ہوگا؛ چونکہ اس

قرآن کی تعبیر میں اختلاف

سوال کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے (بلکہ یوں کہیئے کہ اسے یہ کہہ کر اچھالا جاتا ہے) کہ قرآنِ کریم قانون کی بنیاد بن ہی نہیں سکتا۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق ذرا وضاحت سے بات کی جائے۔

(۱) قرآنِ کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کے لئے ثبوت یہ پیش کیا ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ سورۂ نساء میں ہے :-

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ - وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (۴/۸۲)

کیا یہ لوگ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے؟ اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ اس میں بہت اختلاف پاتے۔

اس سے ظاہر ہے کہ دو مختلف باتوں کو قرآنِ کریم کی طرف سے سند یا تائید مل ہی نہیں سکتی۔

(۲) اس نے کہا ہے کہ وہ آیا ہی اختلافات مٹانے کے لئے ہے۔

وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ (۱۶/۶۴)

اور ہم نے تجھ پر یہ کتاب اس لئے نازل کی ہے کہ تو ان کے لئے وہ باتیں واضح طور پر بیان کر دے جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔ (یوں) یہ قرآن ان لوگوں کیلئے ہدایت اور رحمت ہے جو اس کی صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

(۳) وہ تاکید کرتا ہے کہ جس بات میں تمہیں اختلاف ہو اس کے لئے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرو۔ تمہیں وہاں سے حتمی فیصلہ مل جائے گا۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗ اِلَى اللّٰهِ۔ (۴۲/۱۰)

اور تم جس بات میں بھی اختلاف کرو۔ تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف سے ہو۔

(۴) اس کی رُو سے، اختلاف خدا کا عذاب ہے۔ اس نے جماعتِ مومنین سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ :-

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔ (۳/۱۰۴)

اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے (خدا کی طرف سے) واضح ہدایت آ جانے کے بعد باہمی تفرقہ اور اختلاف کیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے سخت عذاب ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر قرآنِ کریم کے اس قدر حتمی اور یقینی دعاوی کے باوجود اس کی آیات کا ایسا مفہوم سمجھ میں ہی نہیں آ سکتا جس میں اختلاف نہ ہو، تو یہ کتاب نوعِ انسان کے لئے ابدی ضابطہ قوانین و ہدایت بن کیسے سکتی ہے؛ پھر تو اس کے تمام دعاوی (معاذ اللہ) باطل قرار پا جائیں گے۔ قرآن ایسی کتاب نہیں ہے۔

قرآنِ کریم نے اپنے سمجھنے کے لئے خود ہی اصول بیان کر دیئے ہیں۔ اگر قرآنِ کریم کو خود قرآن کریم سے، اس کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس کے احکام و قوانین کے سمجھنے میں کوئی اختلاف پیدا

قرآن فہمی کا طریق

نہیں ہوسکتا۔ یہ جو آپ اس وقت مختلف فرقوں میں اختلاف دیکھتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ قرآن کریم ان میں سے ہر ایک کو اس کے مسلک کی تائید بہم پہنچا رہا ہے۔ اگر ایسا ہو تو قرآن کے منجانب اللہ ہونے کا دعوےٰ ہی (معاذ اللہ) باطل قرار پا جاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف فرقے، قرآن کریم کو خارج از قرآن چیزوں کے تابع رکھتے ہیں۔ یعنی یہ فرقے اپنے اپنے عقائد، مسالک اور احکام کو حتمی۔ یقینی اور غیر متبدل اسلامی قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ قرآن کی طرف آتے ہیں۔ اگر انہیں ان احکام و قوانین کی تائید میں قرآن کریم کی کوئی آیت مل جاتی ہے تو اسے بھی تائیداً ساتھ رکھ لیتے ہیں۔ اگر قرآن کی آیت اس کے خلاف جاتی ہے تو اس آیت کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ وہ اس حکم کے مطابق دکھائی دے۔ اور اگر ایسا ناممکن ہو تو پھر کہہ دیتے ہیں کہ قرآن کا حکم منسوخ ہے۔ آپ متبعین حدیث کا یہ عقیدہ پہلے دیکھ چکے ہیں کہ حدیث، قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ باقی رہے اہل فقہ (حنفی حضرات) تو ان کے ایک ممتاز اور مسلّم امام، ابوالحسن عبید اللہ الکرخیؒ کا یہ قول ان کے عقیدہ کو واضح کرتا ہے کہ:۔

فقہ اور قرآن

ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں، وہ یا تو ماؤل ہے یا منسوخ ہے، اور اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو وہ ماؤل یا منسوخ ہے۔ (علامہ الخضری۔ صـ ۳۴۲)

ان تصریحات کی روشنی میں یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ جس چیز کو قرآن کی تعبیر میں اختلاف کہا جاتا ہے وہ درحقیقت قرآن کی تعبیر کا اختلاف نہیں ہوتا بلکہ جن چیزوں کو مختلف فرقوں نے قرآن پر قاضی اور حاکم بلکہ اس کا ناسخ قرار دے رکھا ہے وہ ان چیزوں کا اختلاف ہوتا ہے۔ اور یہ اختلاف ہوتا ہے فرقوں کی باہمی ضد کی وجہ سے۔

وَآتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْأَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۔۔۔ (۴۵/۱۷)

اور ہم نے انہیں اس معاملہ (دین) کے متعلق واضح باتیں دی تھیں۔ لیکن انہوں نے العلم (وحی) آجانے کے بعد آپس میں اختلاف کیا۔ اور اس اختلاف کی وجہ محض ان کی باہمی ضد تھی۔

اگر فرقہ بندی کی باہمی ضد کو الگ رکھ کر، اُمّت خالص قرآن کی طرف آجائے تو اس کے احکام و قوانین میں کسی قسم کا اختلاف نہیں رہ سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے زندگی کے لئے جو ضابطہ عطا فرمایا ہے اگر وہ بھی صاف، واضح اور متعین نہیں تو پھر اس کے اس دعوےٰ کا (معاذ اللہ) کچھ مطلب ہی نہیں کہ وہ نوعِ انسانی کے لئے صاف، واضح۔ مکمل۔ واحد اور آخری ضابطۂ حیات ہے۔

شخصی قوانین

اب رہا حضرات علمائے کرام کا یہ مطالبہ کہ جہاں تک شخصی قوانین (PERSONAL LAWS) کا تعلق ہے ہر "مسلم فرقہ" کو اجازت ہو کہ وہ کتاب و سنت کی تعبیر اپنے عقیدہ کے مطابق کرے۔ اس باب میں سوال یہ ہے کہ کیا یہ حضرات کتاب اللہ یا سنتِ رسول اللہ سے (جسے بھی وہ اپنے عقیدہ کے مطابق سنت سمجھتے ہوں) اس امر کا اشارہ تک بھی پیش کر سکتے ہیں کہ اسلام شخصی قوانین اور ملکی قوانین میں تفریق کرتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ تصوّر اس وقت میں پیدا ہوا جب سیاست کو مذہب سے الگ کر لیا گیا۔ ملکی قوانین اہلِ سیاست نے اپنے پاس رکھے اور شخصی قوانین کو مذہبی پیشوائیت کی طرف منتقل کر دیا۔ ہندوستان میں جب انگریزوں کی حکومت آئی تو انہوں نے مذہبی آزادی کا اعلان کیا۔ اس کے مطابق انہوں نے ملک کے قوانین اپنے ہاتھ میں رکھے اور شخصی معاملات، قانونِ شریعت کے مطابق طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ یوں

ہمارے ہاں ملکی اور شخصی قوانین کی تفریق زندہ رہی۔ اب خدا کے فضل سے ہماری اپنی آزاد مملکت ہے جس کے لئے اسلامی قوانین کی تدوین کا سوال زیرِ غور ہے۔ اس مملکت میں ہمارے علمائے کرام اس ثنویت کو برقرار رکھنے اور مستحکم کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں جو دورِ ملوکیت میں پیدا ہوئی اور انگریزوں کی غلامی کے زمانے میں پروان چڑھی! یا للعجب۔

فرقوں کا وجود

قرآنِ کریم نے تو فرقوں کے وجود ہی کو بالفاظِ صریح شرک قرار دیا ہے۔ اس نے مسلمانوں سے تاکیداً کہا کہ دیکھنا! تم مسلکِ توحید اختیار کرنے کے بعد، کہیں مشرک نہ ہو جانا۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ۔ (۳۰/۳۱-۳۲)

تم مشرکوں میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان میں سے جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے۔ اور خود بھی الگ گروہ بن بیٹھے۔ (پھر حالت یہ ہو گئی کہ) تمام فرقے اپنے اپنے مسلک پر اترا رہے ہیں۔

اس نے نبی اکرمؐ سے برملا کہہ دیا کہ:۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ۔ (۶/۱۵۹)

وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور گروہ بن گئے۔ (اے رسولؐ) تیرا ان سے کچھ واسطہ نہیں۔

ان نصوصِ صریحہ کی موجودگی میں، فرقوں کی گروہوں کو آئینی طور پر مضبوط کرانے کی کوشش کرنا، آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ کیا کہلائے گی۔ ہمیں تسلیم ہے کہ آج ہم میں فرقے موجود ہیں۔ اسے بھی ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرقے سشباشب نہیں مٹ سکتے۔ اس لئے ان کے وجود کو سردست، اضطراری طور پر گوارا کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ہم جس قدر جلد ممکن ہو، اس "مشرکانہ حالت" سے نکل کر موحدانہ منزل میں پہنچ جائیں۔ اس کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ مملکت، قرآنِ کریم کی بنیادوں پر ایسا ضابطہ، قوانین مرتب کرے کہ جس کا اطلاق تمام اُمت پر یکساں طور پر ہو۔ اس سے خود بخود اختلافات ختم ہو جائیں گے۔

فرقوں کے وجود کو بامرِ مجبوری علیٰ حالہٖ رہنے دینے سے مطلب یہ ہے کہ جس جس طریق سے کوئی فرقہ اپنے ہاں نماز وغیرہ ادا کرتا ہے اس میں سردست دخل نہ دیا جائے۔ یاد رہے کہ اسلام میں عبادات اور معاملات میں کوئی فرق نہیں۔ "عبادت" کے معنی احکامِ خداوندی کی اطاعت ہیں۔ لیکن چونکہ ہمارے ہاں مختلف فرقوں نے "عبادت" (بمعنی پرستش) کے طور طریقوں کو اپنا امتیازی نشان قرار دے رکھا ہے اس لئے جب تک فرقوں کا وجود برداشت کیا جائے گا اس وقت تک ان کی "عبادت" کے طور طریق سے بھی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ تاآنکہ کچھ وقت کے بعد، صحیح تعلیم و تربیت سے، ہماری آنے والی نسلیں خود محسوس کر لیں کہ دین میں اس تفریق کی قطعاً اجازت نہیں۔ اُس وقت نماز کا بھی ایک ہی طریقہ ہوگا، اور جس طرح قرنِ اوّل میں ہوتا تھا امام، خود

حکومت کے ارکان ہوں گے۔ طلوعِ اسلام کی یہ دعوت بھی کچھ نئی نہیں۔ وہ پہلے دن سے یہ اعلان کرتا چلا آ رہا ہے کہ:-

اُمت کے مختلف فرقے۔ نماز، روزہ وغیرہ میں جس جس طریق پر عمل پیرا چلے آ رہے ہیں۔ اس میں ردّوبدل کرنے کا حق کسی فرد یا کسی گروہ کو حاصل نہیں۔

خود طلوعِ اسلام نے نماز کا کوئی نیا طریقہ وضع نہیں کیا۔ فرقہ اہلِ قرآن نے ایسا کیا ہے اور یہ اس کی سخت مخالفت کرتا چلا آ رہا ہے۔ نہ ہی اس نے کوئی نئی فقہ ایجاد کی ہے۔ اس نے مملکت کے آئین و قوانین کے بارے میں جو کہا ہے کہ اس کی بنیاد قرآنِ کریم کے غیر متبدل اصولوں پر ہونی چاہیئے تو اس لئے کہ پاکستان کا اسلامی مملکت بننا اس کے ایمان کا تقاضا ہے۔ اور اس کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں۔

ہم نے بات یہاں سے شروع کی تھی کہ پاکستان میں اسلامی قوانین کی تدوین کے راستے میں کون حائل ہے۔ جو تصریحات آپ کے سامنے آ چکی ہیں ان سے آپ خود فیصلہ فرما لیجئے اس کے راستے میں خود ہمارے علماء کرام حائل نہیں تو اور کون حائل ہے؟ ان حضرات کا مطالبہ ہے کہ:-

۱- اسلامی قوانین کی بنیاد کتاب و سنت پر ہونی چاہیئے۔

۲- دنیا میں ایسی کوئی کتاب موجود نہیں جس کے مندرجات کو تمام علماء (مختلف فرقے) متفقہ طور پر سنتِ رسول اللہ تسلیم کر لیں۔

۳- نہ ایسی کتاب موجود ہے۔ نہ یہ حضرات ایسی کتاب مرتب کر کے دیتے ہیں۔

۴- انہیں اس کا اعتراف ہے کتاب و سنت کی رو سے پبلک لاء کا کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا، جسے مختلف فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔

۵- یہ اعتراف بھی ہے اور اس کے ساتھ یہ مطالبہ بھی کہ کتاب و سنت کے مطابق ضابطہ قوانین مرتب کیا جائے۔ اور جب ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو پاتا تو دہائی مچا دی جاتی ہے کہ اربابِ اقتدار۔ مغرب زدہ دانشور۔ سوشلسٹ۔ کمیونسٹ۔ منکرینِ حدیث۔ ملحدین۔ مرتدین۔ یہ چاہتے ہی نہیں کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں۔

۶- اور ان سے کوئی نہیں کہتا کہ آپ "ان" "بے دینوں" کے چاہنے یا نہ چاہنے کی طرف نہ جائیے۔ آپ سنتِ رسول اللہ کا کوئی ایسا مجموعہ مرتب کر دیجئے (یا اس کی نشاندہی کر دیجئے) جو تمام فرقوں کے تو دیک متفقہ طور پر سنتِ رسول اللہ قرار پائے۔ اس کے بعد اگر ایسا ضابطہ قوانین مرتب اور نافذ نہ ہو تو پھر جو جی میں آئے کہیئے۔

ہم ملک کے بہی خواہ اربابِ علم و بصیرت کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ وہ ان (علماء) حضرات سے ضرور یہ سوال کریں، تاکہ ملک اس مسلسل خلفشار سے نجات حاصل کر سکے جو یہاں اسلام کے نام پر برپا کیا جاتا ہے۔

حقائق و عبر

۱- انتخابات ـــــ مخلوط یا جداگانہ؟

آجکل پھر یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے کہ غیر مسلموں کے لئے انتخابات مخلوط ہوں یا جداگانہ۔ اگر اس سوال کو سیاسی مصالح کی خاطر اُلجھایا جائے تو اور بات ہے، ورنہ نیک نیتی سے سمجھنے کے لئے اس مسئلہ کا سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں۔ اس کے لئے یہ طے کرنا ضروری ہوگا کہ مملکتِ پاکستان کی پوزیشن کیا ہے؟

۱- اگر آپ کو تسلیم ہے کہ یہ مملکت اسلامی ہے تو اسلامی مملکت میں قوم صرف مسلمانوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ غیر مسلموں کی حیثیت ذمیوں کی ہوتی ہے۔ یعنی وہ ایک ایسی (COMMUNTTY) ہوتی ہے جن کی جان۔ مال۔ عزت۔ آبرو۔ مذہب کی حفاظت کی ذمہ داری مملکت کا فریضہ ہوتا ہے۔ انہیں عام انسانی حقوق حاصل ہوتے ہیں لیکن وہ امورِ مملکت میں حصہ نہیں لے سکتے۔ بنابریں نہ وہ مجالسِ قوانین ساز کے ممبر بن سکتے ہیں نہ ووٹ دینے کے اہل۔ لہٰذا، اس صورت میں مملکت کی اسمبلیوں کے لئے جداگانہ یا مخلوط انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۲- اور اگر کسی کے نزدیک یہ مملکت سیکولر ہے تو سیکولر مملکتوں میں اکثریت اور اقلیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حدودِ مملکت میں بسنے والے تمام باشندے، بلا لحاظ مذہب، ایک قوم کے افراد ہوتے ہیں، اور ایک ہی طریقِ انتخاب سب پر یکساں لاگو ہوتا ہے۔ لہٰذا، اس صورت میں بھی مخلوط یا جداگانہ انتخاب کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

لہٰذا، اصل سوال یہ ہے کہ آپ کے نزدیک مملکتِ پاکستان اسلامی مملکت ہے یا سیکولر مملکت۔ یہ طے کر لیجئے تو طریقِ انتخاب کا سوال خود بخود حل ہو جاتا ہے۔

(پرویز صاحب کا ارادہ ہے کہ وہ یومِ پاکستان - ۲۳ مارچ کی تقریب پر دو قومی نظریہ کی قرآنِ مجید کی روشنی میں وضاحت کریں گے اور قائدِ اعظمؒ کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کو بھی زیرِ بحث لائیں گے۔ امید ہے کہ ان کا یہ درس طلوعِ اسلام کے اپریل ۱۹۷۸ء کے شمارہ میں شائع ہو جائے گا۔)

۲- شیشم کے درخت کے ساتھ نکاح

روزنامہ سیاست (لاہور) کی ۳۱ جنوری ۱۹۷۸ء میں شائع شدہ ذیل کی خبر پڑھ کر ہنسیئے بھی اور رو دیجئے بھی:-

سیالکوٹ۔ ۳۰ جنوری (نمائندہ خصوصی) گذشتہ روز سمبڑیال کے قریب تحصیل ڈسکہ کے گاؤں کلوں میں ایک مردہ خاتون کا شیشم

کے درخت کے ساتھ نکاح پڑھوایا گیا۔ اس واقعہ کے عینی شاہد محمد یوسف گھمن جو کہ ٹیلی فون ریونیو آفس میں ملازم ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ایک شخص حسن محمد کشمیری کی چالیس سالہ دختر کا بغیر شادی کے انتقال ہو گیا۔ چنانچہ جب میت کو جنازگاہ پہنچایا گیا تو لوگوں نے جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا کہ چونکہ اسلام میں جو مرد یا عورت بغیر نکاح کے فوت ہو جائے اس کا جنازہ جائز نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس عورت کا جنازہ جائز نہیں ہو سکتا۔ اس پر متوفیہ کے ورثاء نے جنازگاہ ہی میں اس علاقہ کے مولوی برکت علی سے عورت کا نکاح شیشم کے درخت سے پڑھوایا اور اس موقع پر آئے ہوئے لوگوں کو چاول پکا کر کھلائے گئے جس کے بعد اس کا جنازہ پڑھا کر دفن کر دیا گیا۔

یوں تو آپ اس خبر کو "جہالت" سے تعبیر کر کے جھٹک دیں گے لیکن اس میں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ مسئلہ یہ بتایا گیا ہے کہ جو مرد یا عورت بلا نکاح فوت ہو جائے، اسلام کی رو سے اس کا جنازہ جائز نہیں۔ یہ بات اس گاؤں کے جہلا تک محدود نہیں۔ آپ بڑے بڑے جید علماء اور اقامتِ دین اور نظامِ اسلامی کے مرعیوں کی زبان سے صبح شام اس قسم کے الفاظ سنیں گے کہ "اسلام میں اس کی اجازت نہیں"۔ اسلام کی رو سے ایسا جائز نہیں۔ شریعتِ اسلامی کا حکم یہ ہے۔ وغیرہ۔ یعنی یہ حضرات کبھی یہ نہیں بتائیں گے کہ کس نے ایسا کہا ہے۔ اس حکم کا حوالہ کیا ہے۔ اس کی سند کیا ہے۔ جو کچھ انہوں نے فرما دیا بس وہی سند ہے۔ اگر کوئی اس سے انکار کرے تو وہ منکرِ اسلام ہے۔ ملحد ہے۔ بے دین ہے۔ یہ لوگ ان اصطلاحات کو دانستہ مبہم رکھتے ہیں۔ اگر آپ ایسا کہنے والوں کو سند اور حوالہ دینے کا پابند بنا دیں تو آپ دیکھیں گے کہ کتنے الجھاؤ صاف ہو جاتے ہیں۔ اور ان لوگوں کے "اسلامی احکام" کی قلعی کس طرح کھل جاتی ہے۔

اور خبر میں دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ علاقہ کے مولوی صاحب نے متوفیہ کا نکاح شیشم کے درخت سے پڑھایا۔ یہ ہے نمونہ ان مولوی صاحبان کا جو کہتے ہیں کہ اقتدار ہمارے ہاتھ میں دو تاکہ ہم یہاں اسلامی نظام نافذ کر سکیں! اور مقطع کا بند "چاولوں کی دیگ" جو نقطۂ ماسکہ ہے ان حضرات کے "اسلام" کا!

۳۔ اسلامی نظام اور فقہ حنفی

مسلکِ اہلِ حدیث کے ترجمان ہفت روزہ معاصر الاعتصام کی ۲۷ جنوری ۱۹۷۸ء کی اشاعت میں، مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:۔

مولانا مفتی محمود صاحب کا ایک بیان روزنامہ "جسارت" ۱۰ جنوری ۱۹۷۸ء میں پڑھ کر میری حیرت کی حد نہ رہی ——— پیٹوں جگر کو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں! ——— مفتی صاحب فرماتے ہیں: "پاکستان میں حنفی مسلک کو بطور متن نافذ کر دیا جائے اور اگر کوئی معاملہ حل نہ ہو تو پھر کسی اور مسلک سے مدد لی جائے۔ اسلام ترقی کا دین ہے"۔

حنفیوں کو حنفی مسلک چاہیئے۔ شافعیوں کو شافعی مسلک۔ مالکیوں کو مالکی مسلک۔ حنبلیوں کو حنبلی مسلک۔ بریلویوں کو بریلوی مسلک مطلوب ہے۔ میں مفتی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ رسول اللہ (صلعم) نے تیرہ سال مکہ مکرمہ میں لرزہ خیز مصائب جھیل کر اور دس برس مدینہ منورہ میں ہزاروں جانوں کی قربانی دے کر جو مذہب صحابہؓ اور قیامت تک کے مسلمانوں کو دیا تھا وہ کیا تھا اور اس کا نام کیا ہے۔ ..... حنفی مذہب کا نام رسول اللہ کے اسلامی نظام سے چار سو سال بعد ظہور پذیر ہوا۔

حنفی مذہب کا نام نہ صحابہؓ نے سنا۔ نہ تابعینؒ نے۔ نہ تبع تابعینؒ نے سنا۔ سلف صالحین کے نیک زمانوں میں حنفی مذہب کا نام و نشان نہ تھا۔

آپ بنوائیے ان حضرات سے مملکت کا اسلامی ضابطہ قوانین!

۴۔ انہیں تاریکی راس آتی ہے؟

ہمارے دَور میں میڈیکل سائنس نے اِس حد تک ترقی کر لی ہے کہ ایک مردہ انسان کی (بیکار) آنکھ کو زندہ اندھے انسان کی آنکھ میں پیوست کر کے اسے بینا (دیکھنے والا) بنا دیا جاتا ہے۔ یہ انسانیت پر بہت بڑا احسان ہے۔ لیکن ہمارے تاریکی پسند حضرات کے نزدیک ایسا کرنا خلافِ اسلام اور شریعت کی رُو سے ناجائز ہے۔ کوئی دس سال اُدھر کی بات ہے' جماعتِ اسلامی کی طرف سے یہ فتویٰ صادر ہوا تھا کہ اسلام کی رو سے 'مُردوں کے اعضاء کی زندہ انسانوں میں پیوستگی ناجائز ہے۔ (ایشیا۔ ۲۴ مارچ ۱۹۶۸ء۔ بحوالہ طلوعِ اسلام، مئی ۱۹۶۸ء۔ صفحہ ۴۱) اب (مولانا) احتشام الحق صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ:-

> شریعتِ اسلامی کی رو سے ایک انسان کا خون دوسرے انسان کے بدن میں چڑھانا تو جائز ہے مگر ایک بدن کے اعضاء کی پیوندکاری دوسرے بدن کے ساتھ اسلام میں ناجائز ہے۔ (روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۳ جنوری ۱۹۷۸ء)

سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ:-

مکتب و ملّا و اسرارِ کتاب   کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب

آپ تو اندھوں کو بینائی عطا کرنے کی سوچتے ہیں۔ ان شپرہ چشموں کے بس میں ہو تو یہ تمام دیکھنے والے انسانوں کی آنکھیں پھوڑ کر انہیں اپنے جیسا بنا لیں۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ:-

ہمیں سکون میسر ہے ظلمتِ شب میں   ہمارے سامنے نورِ سحر کا ذکر نہ کر

ضمناً۔۔۔ آپ نے دیکھا کہ ان دونوں فتووں میں کہا یہ گیا ہے کہ "شریعتِ اسلامی کی رو سے" اور "اسلام کے نزدیک"۔۔۔ سند اور حوالہ نہ جماعتِ اسلامی والوں کے نزدیک ضروری ہے، نہ مولانا احتشام الحق صاحب کے لئے۔۔۔ یہ حضرات خود ہی اسلام اور شریعت ہوتے ہیں۔

ضروری اعلان

(۱) جواب طلب امور کے لئے جوابی خط بھیجئے ورنہ تعمیل نہیں ہوگی۔

(۲) ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک پرچہ نہ ملنے کی شکایت پر پرچہ بلا قیمت بھیجا جائے گا۔

(۳) خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

(۴) یہ پرچہ ۶۴ صفحات کی بجائے ۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

(ناظمِ ادارہ)

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

بزمِ طلوعِ اسلام لندن (انگلینڈ) بمقام ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)
149 SUTTON COURT Rd
LONDON L 13
PHONE 01-552-1517

لاہور میں ہر جمعہ ½9 بجے صبح (فون 80800)
۲۵/بی - گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)

کمالیہ میں ہر جمعہ ½۳ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بالمقابل چکی) اقبال بازار (لائلپور)

لیہ میں ہر ہفتہ کے دن بعد نمازِ مغرب کیپٹن غلام حیدر خان کے مکان (نمبرا ۳۵ وارڈ ۵) واقع عقب گلی گرلز ہائی اسکول (بذریعہ ٹیپ)

جام پور میں ہر جمعہ بعد نمازِ عشاء (بذریعہ ٹیپ) بلوچ جنرل اسٹور - اڈہ روڈ (ڈیرہ غازیخاں)

پشاور میں ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ)
بر مکان آغا محمد یونس - A-9 رفیق لین سٹیڈیم روڈ صدر

ملتان میں ہر جمعہ صبح ۱۰ بجے (بذریعہ ٹیپ)
دفتر شاہ سنز - بیرون پاک گیٹ (فون 72071)

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
۶۵ کوتوال روڈ (حیات سرجری کلینک) (بالائی منزل) (فون 29119)

گجرات میں ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ نیز بروز اتوار چار بجے شام بمقام ۱۲/۱/بی - بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
جی ۱۶۶ لیاقت روڈ

جلالپور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں) (گجرات)

مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابوں کی کہانی

وہ منفرد معلومات افزا کتاب جس کا پہلا ایڈیشن ایک عرصہ ہوا ختم ہو گیا تھا، دوبارہ شائع ہو گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ دنیا بھر کے مذاہب کی مبیّنہ آسمانی کتابیں کس طرح مرتب ہوئیں۔ کن مراحل سے گذریں اور اب وہ کس شکل میں ہیں۔ تورات - انجیل - وید - دھرم شاستر - رامائن - مہابھارت - ژند اوستا (مذہب زرتشت) - بدھ مت کی کتابیں - جین مت کی کتابیں - اہلِ چین (کنفیوشس ازم) کی کتابیں - اہلِ جاپان (شنٹو ازم) کی کتابیں - انکی پوری تاریخ اور آخر میں اس حقیقت کا تفصیلی بیان کہ قرآنِ مجید پہلے دن سے ایک مرتب کتاب کی شکل میں دنیا میں محفوظ چلا آ رہا ہے۔ اس کتاب سے جہاں ان مذاہب کے متعلق عجیب و غریب معلومات حاصل ہوں گی وہاں مفکرِ قرآن کی وسعتِ مطالعہ اور عمیق تحقیق کا بھی اندازہ ہو سکے گا —— سفید کاغذ - بکس بورڈ کا کور اور گرد پوش - قیمت - ۲۱ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ } (۱) مکتبۂ دین و دانش - چوک اُردو بازار لاہور - (۲) ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور